۴۲ نظمیں

ایک روایت ایک بغاوت

ڈاکٹر سید محمد صدرالدین

مکتبہ فروغِ ادب باقر گنج پٹنہ ۴

۴۲ نظمیں ایک روایت، ایک بغاوت

ڈاکٹر سیّد محمد صدرالدّین فضا شمسی (علیگ)
ام - اے (ٹرپیل) ڈی لٹ
صدر شعبۂ اُردو - پٹنہ کالج - پٹنہ ۵

ادارۂ فروغ ادب، باقر گنج - پٹنہ ۴

معنوی حیثیت سے جو کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے، وہ ہے ان کی "پُر اسرار معنویت"
آج کے پیچیدہ اور تہہ در تہہ اقتصادی اور سماجی تقاضوں نے شاعر کے محسوسات
و تجربات پر پیچیدگی کی تہیں جما دی ہیں۔ اس لئے اظہارِ خیالات میں ابہام آگیا
ہے، تاکہ پڑھنے والا بیان کے پیچ و خم میں اُلجھ کر رہ جائے۔

جہاں تک ہئیت کا تعلق ہے، کلیم صاحب نے بالقصد ایک جدّت پسند اور ترقی پسند
شکل اختیار کر کے غزل کے فرسودہ قالب کو خیرباد کہہ دیا۔ انہوں نے غزل کو نیم وحشی
صنفِ شاعری کہا ہے۔ یہ ریمارک سو فی صد صحیح ہے، مگر وہ خود بتائیں کہ کیا ہم لوگ
ان دنوں نیم وحشی دَور سے نہیں گذر رہے ہیں۔ بعض احباب غزل کو مفرد اشعار کا ایک
گلدستہ تصور کرتے ہیں، جس کو مالی نے صرف قافیہ اور ردیف کے رشتے میں باندھ کر
ایک کر دیا ہو۔ میرے خیال میں یہ رائے قدیم غزلوں پر صادق آئے تو آئے، جس دَور
میں کلیم صاحب کی شاعری نے بال و پَر نکالے ہیں۔ اس دور میں غزل تمام کی تمام مفرد
اشعار کا گلدستہ نہیں بن کر رہ گئی تھی، آخر اقبال بھی اسی دَور کے شاعر تھے اور اقبال
نے غزل میں ایک نئی راہ نکال لی، جو غزل ہوتے ہوئے بھی پرانی راہ سے الگ رہی۔

رشید احمد صدیقی نے غزل کو اُردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ کلیم الدین احمد نے
اس کو نیم وحشی صنفِ شاعری بتایا اور حالی نے ایسی شاعری کو عفونت کا سڑاند قرار
دیا۔ بہ ظاہر تینوں خیالات متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ تینوں ایک دوسرے
کی تعبیر اور تشریح ہیں، ان میں تضاد قطعاً نہیں۔ رشید صاحب کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ
اردو شاعری میں خرافات و مزخرفات جگہ پا چکے ہیں۔ ان کی لاج اگر رکھ لی ہے، تو
غزل نے، یعنی غزل گو نے اپنی صنفی خامیوں کے باوجود اردو میں دیگر اصنافِ سخن
سے کہیں زیادہ التفات حاصل کی ہے اور اگر یہی شعری سرمایہ اپنی مقدس سرزمین سے

پرانی لکیر کا فقیر نہیں رہ پاتا، وہ چاہتا ہے کہ روایت پرستی کرے تو الفاظ روٹھ جاتے ہیں، معانی کشیدہ ہو جاتے ہیں اور ذہن خالی خالی نظر آنے لگتا ہے، وہ لاکھ چاہے الفاظ سمیٹے، معنی سمیٹے اور ذہن کی گرفت مضبوط کرے، مگر یہ شوخ و شنگ اشعار پھسل کے دور جا نکلتے ہیں:۔

دیکھو ان شوخ و شنگ شعروں کو
کیسی اٹھکھیلیاں یہ کرتے ہیں
کبھی اپنے لباسِ زرّیں میں
شان اور تمکنت سے چلتے ہیں
کبھی عریانی ان کا زیور ہے
سرِ بازار ننگے پھرتے ہیں
یہ روایت سے دور بھاگتے ہیں

شاعر سراپا نیاز ہو کر شعر کے دربار ناز میں سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور انھیں سمجھاتا ہے کہ وہ پرانی روش سے دور نہ جائیں۔ شعراء نے برابر پامال روش اختیار کی، کذب و افترا اپنا شعار بنایا، لہو و لعب اپنا مشغلہ، حسن اور حسن کی خام کاری پر فریفتہ کیا اور عشق کی مادی برانگیختگی کو عشق کی حقیقت بنا دیا، مگر اب الفاظ اور الفاظ سے بنے ہوئے اشعار زخم خوردہ نقوش ہیں جو ابھرنا چاہتے ہیں، وہ انسانیت کے ناسور ہیں، جو رِس رہے ہیں۔ اس لئے اب حسن و عشق ایک مہمل سی بات ہو کے رہ گئی، اسی حیص بیص کے عالم میں شاعر اپنے شعروں کی فطری خصوصیات یاد دلا کر انھیں آمادہ اطاعت کرنا چاہتا ہے، یہی اشعار متضاد پہلوؤں کے حامل ہیں اور چونکہ سخن ایک یزدانی صفت ہے

اس لئے شعر میں بھی وہ یزدانی اثر حلول کر گیا ہے:

کبھی یہ برف ہیں، کبھی شعلہ
پیاس دل کی کبھی بجھاتے ہیں
دل کو ٹھوکر کبھی لگاتے ہیں
کسی کو تخت پر بٹھاتے ہیں
اور پھر تاج چھین لیتے ہیں

(اس کا پانچواں مصرع غیر موزوں نہ سمجھئے گا۔ اس بحر میں اس طرح کا زحاف جائز ہے: مثلاً

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

اشعار کی یہ شوخی دیکھ کر شاعر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور انھیں طرح طرح سے سمجھاتا ہے مگر ان کا جواب ملتا ہے:

مجھے کیا کام کوئے دلبر سے
کچھ دل زار میرے پاس نہیں

یہ دونوں مصرعے پڑھیئے اور ساتھ ساتھ اقبال کا یہ شعر بھی ذہن میں رکھیئے:

بکوئے دلبرے کارے ندارم
دل زارے غم یارے ندارم

اس کے اشعار کیا چاہتے ہیں، یہ پڑھنے والے خود سوچیں، سوچنے کے لئے جزوی

تفصیل حاضر ہے، بیانات کے ہر گوشہ میں اس کی روشنی پھیل گئی ہے۔ اس لئے کوئی امر وضاحت طلب نہیں رہتا، یہاں دستور زباں بندی ہے۔ اس لئے ہماری زبان لال ہو گئی ہے، مگر ناخن سلامت ہے۔ ناخن فہم اب کام کرے اور اپنے مطلب کی باتیں کھرچ لے۔ سو پردوں میں ایسی بات کہی گئی ہے۔ جو مشک کی طرح کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی،

حُسن ان سے جمال ان سے ہے
کبر ان سے جلال ان سے ہے
دلِ عاشق میں ہے سرور ان سے
مری آنکھوں میں ہے جو نور ان سے

شعراء کے یہاں تعلّی ان کا امتیازی نشان رہا ہے۔ مگر کلیم صاحب نے تعلّی کی علت سے کس طرح نجات پائی ہے۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ یہ تو تعلّی کے پردے میں حقیقت کی تجلّی دکھا گئے۔ ظاہر ہے ان کے اشعار وہ نہیں ہونگے جو لہو و لعب میں مشغول کریں اور یاد خالق سے بے نیاز کر دیں۔ یہ اشعار تو طرح طرح سے خالق کی یاد دلا کر ذہن کی تربیت کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ شعر کے اس زمرہ میں آتے ہیں، جن کے لئے کہا گیا ہے، ان من الشعر لحکمۃ (بیشک بعض شعر حکمت ہیں)

اس نظم میں ایک محاورہ ہے تو برجستہ، مگر ہے اخلاقی اعتبار سے خستہ، ٹھینگا دکھانا اردو میں فحش سمجھا جاتا ہے۔ گرچہ انگریزی میں ازرا پاؤنڈ نے اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے، یہ دراصل (Thumb) کا ترجمہ ہے۔ 'انگوٹھا' کا لفظ لانے پر بھی کام چل جاتا۔

(۲۹) انتیس[۲۹] مصرعوں کی یہ نظم ہمارے سامنے ایک ایسا تجربہ لاتی ہے،

جو اُردو شعراء آج تک پیش نہ کر سکے، صوفیانہ میلان تو اُردو شاعری کا مزاج ہی بن گیا تھا۔ مگر اس میں اثرات اور نظریات کا بیان کرنا ہی کافی سمجھا جاتا رہا، ان تاثرات اور نظریات کو کن تجربات کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ اس کا ذکر نہ تھا۔ اس چھوٹی سی نظم میں یہ انداز بیان اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ اس قسم کی کوشش عام نہیں۔ اس لئے باوجود ابہام کے یہ نظم کامیاب ہے۔ انگریزی میں EMILI BRONTI ایملی برونٹی نے اس کے دونوں حصوں سے کام لیا ہے، ورڈ سورتھ بھی دونوں طریقوں کو بروئے کار نہیں لاتا ہے۔

'یہ دل میں مرے کون مہمان آیا، ٹیپ کے مصرع کے طور پر تین بار استعمال ہوا، اور ہر بار ایک نیا رخ پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس تکرار سے بدمزگی نہیں آتی اور نظم کی اکائی کسی طرح مجروح نہیں ہوتی۔ مصرعوں کی پیوستگی پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ الفاظ خیالات کی لہریں بدلتے رہتے ہیں اور اس طرح ارتقا کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ انسانی تجربہ ہے کہ جب کسی عظیم شئی کا انتظار ہوتا ہے، تو ایک پُرسکون ماحول سے ابتدا ہوتی ہے اور دھیرے دھیرے یہ سکون ہیبت اور دہشت سے بدل جاتا ہے، جب خدا کو انسان اپنے دل میں مہمان کرنا چاہے گا، تو پہلا تجربہ اسی صدمہ کا ہوگا۔ اس کے بعد یزداں کی عکس ریزی سے ذرہ ذرہ تاباں و منور ہو کر بار دگر فرحت و انبساط کی لہریں پیدا کرے گا اور یہ توازن برقرار رہے گا، اس نظم میں بھی اسی قسم کا تجربہ بیان ہوا ہے۔ جس کو ہم اس مصرع میں ادا کر سکتے ہیں: 'اک ترے آنے کے پہلے اک ترے جانے کے بعد'

آغاز محبت میں دل پر جمود و خمود نہ تھا، سکون چھن چھن کر مینائے گردوں سے آ رہا تھا، اور خوشی ہی خوشی چہار سمت چھائی ہوئی تھی:

خوشی برستی تھی اوج فلک سے
ہوا میں سکون تھا، چمن میں سکوں تھا
جو چشمے تھے تصویر حیرت تھے گویا
گل و لالہ کرتے تھے دل کو اشارے
کوئی آ رہا ہے، کوئی آ رہا ہے

یہ دل میں مرے کون مہمان آیا

کسی کے آنے اور دل میں سما جانے سے ساری دنیا ہی بدل گئی، ایک تہلکہ مچ گیا، وحشت چھا گئی، سراسیمگی بڑھ گئی۔ دل دھڑکنے لگا، — نہ سدھ کی رہی اور نہ بدھ کی رہی، احساس ندامت نے اک آگ لگا دی:

اُبلتے ہیں آنسو، تڑپتی ہیں آہیں
دھڑکتا ہے دل، کیسی وحشت ہے طاری
کہ جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہے
لہو کھولتا ہے یہ کیسا رگوں میں
مرے ہوش کا ہوش اب کھو رہا ہے

شاعر اپنے دل کو اس مہمان کے لائق نہیں پاتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں اس مہر درخشاں کی جگہ نہیں رکھی تھی — مگر رفتہ رفتہ ساری کوتاہیاں رفع ہو گئیں اور اس حسن مطلق نے دل کو گھر بنا لیا، تیسرے ٹکڑے میں لہجہ بدل گیا، اب ذرہ ذرہ میں اسی کا جلوہ پرتو فگن نظر آتا ہے، وہی پھولوں اور پھولوں کی خوشبو میں پراگندہ کتاب ہو کر سامنے آ گیا۔ اس کا کھویا

ہوا ہوش لوٹ آیا، نئی دنیا کروٹ لیتی ہوئی معلوم دکھائی دیتی ہے، زمین بدلی ہوئی، آسمان بدلے ہوئے۔ اب وہی امانت الٰہی کا بار بردار بن جاتا ہے، اب وہ نیابت الٰہی کا سزاوار ہو جاتا ہے۔ اس کا دل نور کی کھیتی بن کر سامنے گلشن کو منور کر دیتا ہے اور ہر جگہ پھر وہی اگلا سا سکون اور اگلا سا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، مگر ان دونوں سکون میں فرق ہے۔ پہلا سکون تاریکی و ظلمت کا سکون تھا اور یہ سکون نور اور ضیا کی برکتوں کا حاصل شدہ ہے۔

رگوں میں سکوں ہے، لہو میں سکوں ہے
کب ایسا سکوں میری آنکھوں نے پایا
جو دنیا کو دیکھا، تو دنیا نئی ہے
نہ وہ آسماں ہے، نہ اب وہ زمیں ہے
زمیں سے اُبلتا ہے اِک نور گویا

شاعر کو ہم صوفی تو نہیں کہہ سکتے ہیں، مگر ان تجربات کا حامل وہ انسان کہا جا سکتا ہے، جس نے اپنے دل کو مقام یار بنا لیا اور اس کی تجلیوں کو سہہ گیا، وہ جسد خاکی رکھتے ہوئے بھی دَنیٰ فَتَدَلّٰی کا مصداق بن گیا، جو سہہ سکا اور بیہوش ہو کر گر پڑا اس کو اپنی کوتاہیوں کے اعتراف کا ہوش باقی رہا اور جو نہ سہہ سکا اور نہ ہوش میں رہ سکا۔ وہ انا الحق کہہ بیٹھا اور اگر مدد ایزدی ساتھ رہی تو یہ کہہ کے رک جاتا ہے۔

نئے حسن سے جگمگاتی ہے دنیا
زمیں میں چمک ہے، فلک پر چمک ہے
گل و لالہ روشن ہیں جیسے ستارے

ستاروں کی کرنوں میں جان آگئی ہے
مرے دل میں یہ کون مہمان آیا

(۳۰) ۳۷ مصرعوں سے مرکب یہ نظم بھی ایک نیا تجربہ پیش کرتی ہے اور اُردو شاعری کو ایک نیا موڑ عطا کرتی ہے، جس میں تاثرات کو تجربات کا نتیجہ بنا کر پیش کیا گیا ہے:

یہ خواب کی دنیا ہے
یا گلشنِ رعنائی
پھولوں میں لطافت ہے
اور سرو میں زیبائی
شبنم کی چمک میں ہے
تاروں کی ضیا باری

شاعر جو کچھ دیکھتا ہے (اور بہت کچھ دیکھتا ہے) یا جو کچھ ہو رہا ہے، یا ہو چکا ہے، ان حقائق کو خواب کی دنیا کے مشاہدات بتا کر تلخیوں اور ناکامیوں کے احساس کو کم کر دیتا ہے۔ یہ جب خواب ہی کی دنیا ٹھہری، تو پھر خیالات میں برہمی اور انتشار کا ہونا ضرور ہے اور ہم اس انتشار کے اس طرح عادی ہو گئے ہیں کہ اپنی بربادیوں کو عین آبادیاں سمجھ بیٹھے ہیں۔

شاعر کا خیال رومانی طور پر تحریک پاتا ہے، وہ اپنے محبوب کو اپنے سرورواں کو ایک نئے انداز میں یاد کرتا ہے۔ یہ سرورواں شاید ازلی ہے یہ اس کے نت نئے جلوے ہیں، جو مختلف اور متفرق شان میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ وہی محبوب جو ظاہر میں ایک سلطان با جبروت ہے۔ باطن میں

خود بھی مجبور و محکوم ہے، جس کی نگاہوں سے چنگیزی کرنیں لہو بن کر نکلتی ہیں۔ اس کے لب مسیحائی کا کام بھی کرتے ہیں اور انھی متضاد اوصاف کی بنا پر لوگ اس کے شیدائی بھی بنتے جاتے ہیں، نہ انسان سراسر قہر بن کر جی سکتا ہے۔ جیسا کہ دین موسوی کی تعلیم تھی، نہ سراسر مجبور و مسکین بن کر جیسا کہ دین عیسوی کا ارشاد تھا، انسان اسی کے آگے جھکنا چاہتا ہے، جو اس کی غلطیوں پر اسے ٹوکے، سزا دے اور پھر اپنی نعمتوں سے اسے مالا مال کر دے۔ ولیم بلیک (W. BLAKE) نے ٹائیگر (TIGER) پر ایک نظم لکھی ہے۔ جس میں اس نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا ہے کہ کیا ایک ہی خدا ہے جس نے بھیڑ پیدا کی اور اس نے شیر بھی بنائے۔

Did he smile his work to see
Did he who made the lamb make thee ?

What immortal hand or eye
Dare frame thy fearful symnetry?

جواب اثبات میں ہے کہ یہی اقتضائے انسانیت ہے اور یہی مشیت ایزدی شاعر کا محبوب ہر آن میں محبوب ہے، وہ تو پھول بھی ہے، کانٹا بھی۔ ذرہ بھی ہے اور زر گل بھی، یہ عالم فانی اس کا کھلونا ہے۔ طرح طرح سے سجاتا ہے اور آن کی آن میں توڑ کے رکھ دیتا ہے۔

کوئی اس طرح مٹاتا ہے کہیں بنا بنا کے
میں نثار خالقیت یہ صنعگری مبارک

سرود رواں کا استعارہ خدا کے لئے ہی لایا گیا ہے، لہجہ نرم ہے، بے باک

نہیں، شکوہ دلفریب ہے، پر فریب نہیں، خاکم بدہن شکوہ اللہ سے ہے مگر انداز تو دیکھئے کہ محبوب کی آنکھ میں آنکھ ملائے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔

اس خواب کے گلشن کو
یہ سرو رواں میرا
پھولوں سے سجاتا ہے
تاروں سے سجاتا ہے
پھر ایک اشارے میں
ویرانہ بناتا ہے

یہ دنیا آس کی بستی ہے اور یاس کی بستی ہے۔ یہ عدم اور وجود دونوں کا سنگم ہے۔ یہاں آس اور یاس اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ حقیقت خواب سے بدل کے رہ جاتی ہے اور خواب میں انسان اپنے واہمہ کی تصویر دیکھتا ہے، اگر اسے احساس جرم ہے، تو وہ اس ہوا سے دور بھاگنا چاہے گا۔ مگر وہ صورت اس کا تعاقب کرتی رہے گی:

اس گلشنِ ہستی میں
اس آس کی بستی میں
اس یاس کی بستی میں
یہ کون خراماں ہے

(۳۱) ۵ مصرعوں پر حاوی یہ نظم نفسیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے، اس انسان کا جو اپنی خواہشوں کو یکسر دبائے رہتا ہے، نہ کبھی انھیں آسودہ کام ہونے دیتا ہے اور نہ انھیں منظم کر کے کسی اچھی راہ پر لگاتا ہے، کسی اچھے کام پر لگ

جانے سے ان خواہشوں کی کثیف تہیں دھل جاتی ہیں اور لطافت نکھر آتی ہے۔ اگر وہ خواہشیں آسودگی تک آگئیں، تو آسودہ جذبات اطمینان قلب عطا کرتے ہیں۔ جہاں یہ دو میں سے کچھ نہ ہوا اور وہ آرزوئیں۔ داغ حسرت دل کا شمار بن کر باقی رہ گئیں، تو ان خواہشوں اور تمناؤں کو انسان اپنے لاشعور اور نیم شعور میں جگہ دے دیتا ہے، رفتہ رفتہ یہ خواہشیں، یہ تشنہ تکمیل امنگیں دماغ کے پردوں پر کھیلتی ہیں اور رات کو ان کا داہمہ نظر آتا ہے (Night Mare)

یہ خواب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان اس وحشت ناک ماحول سے اور اس مہیب گرفت سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور وہ فرار اختیار کرتا ہے۔ لیکن آگے چل کر راہ بند پاتا ہے۔ اس پر خوف اور دہشت اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ بھاگ رہا ہے، بھاگتا جا رہا ہے، اسے راستا بھی مل گیا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ پکڑے جانے کے خوف سے وہ گھبرا جاتا ہے۔ مگر دوڑتا رہتا ہے، الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں، مگر دوڑتا رہتا ہے۔ پیچھا کرنے والے کے پاؤں کی آہٹ نزدیک ہوتی جاتی ہے۔ مگر وہ بھاگتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی آنکھ کھل جاتی ہے، اور وہ اپنے حسین خواب سے بیزار ہو کر ماضی اور حال کے مخمصے میں پڑ کر سوچنے لگتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔

اس کو ہم تنہائی پر ایک نظم کہہ سکتے ہیں، جو تنہائیوں کے احساس کی تندی و تلخی کو پورے طور پر ذہن نشین کرتی ہے۔ تنہائی کی اس شدید تکلیف میں انسان کبھی کبھی اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی ڈر جاتا ہے، گھبرا جاتا ہے۔ اس تنہائی کے احساس کو تلخ تر کرنے کے لئے پہلے ٹکڑے میں اس سکون اور چین کا ذکر ہے

ہجرت کرے اور بقائے افویا کے تحت اپنی بقا کی ضمانت مانگے، تو بڑی بے آبروئی کا سامنا ہو۔

کسی صنف سخن کا نیم وحشی صنف ہونا اس کی دلیل نہیں کہ وہ صنف حتمی طور پر ناقابل قبول اور قبیح ہے، حق تو یہ ہے کہ شاعری خصوصاً غزل جن جذبات کی برانگیختگی کا نام ہے۔ ان کی ترجمانی نیم وحشی دور ہی میں اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ آج پھر دوسرا اُمرؤ القیس یا نابغہ نہ پیدا ہو سکا، دوسرا ملٹن اور شکسپیئر نہ ہوا۔ کوئی دوسرا ورجل اور ہومر نہ ہوا۔ ہمیں غزل کے طبعی انتشار سے گھبرانا نہ چاہیئے کہ یہ انتشار مقامی خصوصیات کا حامل ہے۔ ہندوستان میں جو دور اردو غزل کے عروج کا ہوا، وہی دور سیاسی، سماجی اور اقتصادی حیثیتوں سے انتشار و پراگندگی کا تھا، اس لئے ان غزلوں میں آسودگی اور بے اطمینانی کا اظہار ناگزیر تھا کہ ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تصویر بھی۔

کلیم صاحب کی غزل کی ہیئت سے بے اعتنائی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ مغربی موسیقی کے ہر نکتہ سے آگاہ ہو چکے ہیں، ان کے سامعہ میں یہ آوازیں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ غزل کی پابند موسیقی ان کے لئے ساری کشش کھو چکی ہے، گرچہ پابند موسیقی سے راگ اور نغمے کے جو سوتے پھوٹتے ہیں، ان کو قابو میں کرنے کے لئے کبھی کبھی ان کو بھی ردیف و قافیہ کا سہارا لینا پڑا ہے۔ بایں ہمہ کلیم صاحب غزل کی معنوی خوبیوں سے کنارہ کش نہ رہ سکے، یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا اعتراف نہ کریں۔ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے استقلال و استقرار، چونکہ وہ غزل کی ہیئت سے ایک بار متنفر ہوئے، تو اب وہ اسی خیال پر مستقل اور مستقر رہیں گے۔ حالانکہ جب ان کے جذبات متلاطم ہوئے ہیں، تو انہوں نے غزل ہی کی ٹھنڈی چھاؤں میں پناہ لی ہے، اس کا شگفتہ مظاہرہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ میں ہوا ہے جس کا

جو شاعر کے لئے اپنی آغوش وا رکھتے تھے۔

یہ نرم زمرّد سے سبزے
یہ ٹھنڈے سائے درختوں کے
نظارہ کی دعوت دیتے تھے
آرام کی دعوت دیتے تھے

انسان ان دعوتوں میں گم ہو گیا اور اسے نیند آ گئی، نیند آ ہی گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس جانی پہچانی دنیا میں وہ ایک مسافر ہے، اجنبی ہے۔ ہر طرف سنّاٹا ہے، درخت خموش، غنچے مہر بلب، سبزے اداس، بلبل کی چہک غائب، صرف ایک درد کی ماری کویل کی کراہ سننے میں آ رہی ہے ——
اس خواب نے اس کو دور بہت دور پھینک دیا، جہاں:

راہی ہے نہ کوئی رہبر ہے
کس سے پوچھوں جاؤں کدھر
منزل ہے کہ بھول بھلیّاں ہے
دل حیراں ہے، دل حیراں ہے

اس عالم تحیّر میں جو نشانات ملے، اس کی رہبری میں چل پڑا۔ وہ رہبر نہیں، رہزن نکلے، اس کا راستہ مسدود ہو گیا، وہ کشادہ سا رستہ جو دکھائی دے رہا تھا، سدِ سکندر بن گیا اور منزل پر آتے آتے سامنے ایک پتھر کی دیوار کھڑی ہو گئی:

قسمت پہ اس مسافرِ بیکس کے روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اس عالم خواب میں وہ فرار کی راہ نہ پاکر اور بھی تیز گام ہو جاتا ہے اور دوسری طرف چل نکلتا ہے، پہروں کی دوا دوش کے بعد پھر وہی حشر ہوا:

اللہ یہ کیسا جادو تھا
یہ سدِّ سکندر تھا کہ وہی
دیوار کھڑی تھی پتھر کی
اب کیا ہوگا، اب کیا ہوگا

اب خواب سے فرار کی دوسری صورت بیان ہوتی ہے، راستہ کا نشان مل گیا۔ پھر ایک لمبی چوڑی سڑک پر وہ بے تحاشا چل کھڑا ہوا، چلتا رہا آگے بڑھتا رہا۔ لیکن اس کی بدنصیبی میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا:

میں آگے بڑھا، میں آگے بڑھا
ہلکی سی یہ آہٹ کیسی ہے
جیسے کوئی پیچھے آتا ہو
لیکن جو ذرا مڑ کر دیکھا
سنسان سڑک تھی کوئی نہ تھا
انسان تھا نہ غول بیاباں تھا

ہانپتے کانپتے دوڑتا ہوا، وہ ایک سرسبز و شاداب بستی کی طرف گذرتا ہے، پھر آگے ایک خوفناک جنگل مل جاتا ہے:

پھر ہلکے ہلکے قدموں کے
کچھ چاپ سنائی دیتی ہے
کیا شیر بیر ہے جنگل میں
جو صید کا پیچھا کرتا ہے

یہ بھاری بھاری کس کے قدم
اب پیچھے پیچھے آتے ہیں

مبہوت و حیران انسان اپنی نادانی سے پریشان ہوتا گیا۔ اس کی مجبوریوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی اور وہ خواب میں اپنی نجات کی راہ کو آخر نہ پا سکا:

کیسے میں چھپوں، اب جاؤں کدھر
میں کیسے بچاؤں جان اپنی
اب کیا ہوگا، اب کیا ہوگا

خوف کے اس مقام پر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

کوئی بھی نہ تھا، کوئی بھی نہ تھا
میرے ہی تھے یہ نقش قدم
جو پیچھے پیچھے آتے تھے

اس نظم میں دنیا کی حقیقت اور اس کے تجربات کی مماثلت ایک نئے انداز میں بتائی گئی ہے۔ جس سے زندگی سے محبت ہو جاتی ہے اور اب ایک نگاہ ناز کے بدلے زندگی وار دینا فعل عبث معلوم ہونے لگتا ہے، شاعر زندہ ہے اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہ ساری زنجیروں کو توڑ دینا چاہتا ہے، وہ سد سکندری سے ٹکرانا چاہتا ہے۔ امن کی تلاش میں، سطوت گمشدہ کے کھوج میں انسانیت کی جستجو میں، تاکہ یہ دنیا یہ ٹھوس دنیا، ایک سراب کی دنیا بن کر نہ رہ جائے۔ وہ حیات کے نشاطیہ پہلوؤں کو ابھارتا ہے۔

مایوسیوں کا علاج مایوسی ہی سے اس طرح کر دیتا ہے کہ ہر طرف امید ہی امید کا ستارہ درخشاں نظر آنے لگتا ہے:

(۳۲) ۲۸ مصرعوں کی یہ نظم دراصل نظم نمبر ۲۹ کا ایک سلسلہ ہے، جو تجربات وہاں بیان ہوئے ہیں۔ انھی کا دوسرا رخ اس میں مذکور ہے۔ جب دھڑکتے ہوئے دل میں وہ نور مجسم جاگزیں ہو جاتا ہے، تو آدمی کی صورت ہی بدل جاتی ہیں۔ اس کی افسردگی میں نکھار آجاتا ہے اور اس کے سارے وجود پر بہار آجاتی ہے۔ مگر بہ خوبی ممکن ہے کہ یہ رخ اور یہ تجربہ وقتی ہو، فانی ہو، وہ حسن کل کچھ جھلکیاں دکھا کر روپوش ہو جائے وہ انسان کے دل کی کثافتوں سے گھبرا جائے اور یہاں یہی پیش آتا ہے،

جو دل میں تھا میرے وہ مہمان کہاں ہے

اب پھر وہی ویرانی، وہی وحشت، وہی تنہائی اور وہی اداسی چھا گئی، زمین آسمان، دریا، خشکی، پہاڑ، صحرا، جنگل جنگل جستجو کی۔ مگر اب جو وہ غائب ہوا تو غائب ہی ہے، گرچہ اس کا نور ہر جگہ ہے، وہی غنچوں کی چٹک میں ہے، وہی بلبلوں کی چہک میں ہے۔ وہی ہر ذرے میں جلوہ نما ہے، مگر نظروں سے اوجھل ہے، اس کا نور ہر چہار طرف بکھرا ہوا ہے، مگر انسان اسے اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر ہو جاتا ہے:۔

مگر میں نے اس کا نہ کچھ کھوج پایا
پہاڑوں پہ پہنچا، تو دریا کو جھانکا
ہواؤں سے پوچھا، غزالوں کو ٹوکا
بہاروں میں دیکھا، تو خاروں سے الجھا

رگِ جاں میں کھوجا، تو پردیں کو تاکا
زمیں پر بھی ڈھونڈا، فلک پر بھی ڈھونڈا
کہیں اس کا میں نے نہ پھر کھوج پایا
جو دل میں تھا میرے وہ مہماں کہاں ہے

لازمی طور پر اس مہمان کے چلے جانے سے اور اس طرح بے نام و نشان مہمان سرا چھوڑ دینے سے حیرانی اور اُداسی ہر طرف بکھر گئی۔ جب دل ہی اپنا مغموم ہے تو ساری کائنات غم کا نقاب اوڑھے ہوئے معلوم ہو گی۔ آج پھر محفل سونی ہو گئی، انسان پھر ابتدائی خلقت کے دور کا انسان اکھڑ درا انسان، تاریک انسان بن جاتا ہے، جس کی فلاح و بہبود کے سارے راستے بند ہو گئے۔

نہ پھولوں میں رنگت، نہ پہلی سی بُو ہے
ستاروں کے چہرے بھی گہنا گئے ہیں
مری شمعِ محفل بھی، لو جل بجھی ہے

اب نہ وہ محفل رہی، نہ وہ اہلِ محفل رہے، ماضی آسودہ، عظیم، پُر وقار مگر حال نا آسودہ، پست اور بے اعتبار، شاعر کی رگِ احساس تڑپنے لگتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتا ہے کہ یہ حسرت کی دنیا، یہ حرماں کی دنیا، یہی رنگ لاتی رہی ہے یہ دنیا، وہ احساس کے بوجھ سے دبی ہوئی زبان سے یہ کہہ بیٹھتا ہے:

یہ کیسی مصیبت ہے، کیسی اذیت
یہ دل کی رگیں میری کیوں ٹوٹتی ہیں
عجب درد ہے، کچھ عجب جاں کنی ہے

مری موت بالیں پہ گویا کھڑی ہے
جو دل میں تھا میرے وہ مہماں کہاں ہے

پوری نظم میں ایسے فکر انگیز رومان کی مینا کاری ہے جس سے اس کی دیدہ زیبی کبھی کم نہ ہوگی۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی نظمیں وقتی ہوتی ہیں جو مرورِ ایام کے جھٹکوں کو برداشت نہیں کرتی ہیں اور جلدی دم توڑ دیتی ہیں۔ مگر اس نظم میں جذبات اور تجربات کو خلوص اور حقیقت کا ایسا روپ دیا گیا ہے کہ جب تک جانکنی کا عالم ختم نہ ہوگا، یہ الفاظ زخم پر نمک اور مرہم پر زخم دونوں ہی کا کام کر کے اسے ہرا رکھیں گے، یہی شاعر کا کمال ہے اور اسی سے یہ نظم کئی گوشوں کو متضاد گوشوں کو منور کرتی رہے گی۔ جو نظم کی بقا کی ضمانت ہوا کرتی ہے

(۳۳) گزرے ہوئے دن میرے پھر یاد مجھے آئے
کیسے میں انھیں بھولوں، وہ دن تھے بہت پیارے
ہر صبح سہانی تھی، ہر شام سہانی تھی
فانوسِ تفکر میں قندیل جھلکتی تھی
یا برق چمکتی تھی، ظلمت کو مٹاتی تھی
آنکھوں میں جو تارے تھے، گردوں کے ستارے تھے
ہونٹوں کے تبسم میں بجلی کا تموج تھا

۴۰ مصرعوں کی یہ نظم شاعر کے بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ ایک مانوس سی، لیکن اجنبی اجنبی سی آواز اس کے کانوں میں آئی ہے! اس کے محبوب کی آواز نرم، شیریں، سبک رو، رس بھری ہوئی آواز، موسیقی کی ترنگ میں ڈوبی ہوئی آواز نے اس کے خیالات کو مہمیز کیا ہے۔ وہ ماضی کی، اپنے رخشاں و تاباں ماضی کی یاد میں

محو ہو جاتا ہے جب اسکی رنگین امنگیں اور مچلتی ہوئی کامنائیں اس کی حیات کو سدا بہار بنائے ہوئے تھیں اور جب ساری کائنات میں خوشی گھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی، جب زہر اب بھی امرت تھا۔ وہ ان راتوں کو اور ان دنوں کو یاد کر کے تلملا جاتا ہے۔

یکایک شاعر اس درخشاں ماضی سے اپنے افسردہ ماحول اور سیہ کار حال کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مگر حال ایسا بدحال ہے کہ وہ اپنی محبت، اپنی پرانی مسرت کو بھول جاتا ہے اور اپنے غم کو عوام کے غم میں گھول دیتا ہے۔ وہ اپنی غلامی اور مجبوری کو یاد کر کے حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ غلاموں کے ہاتھوں میں آزادی کا پرچم دیکھ کر مسکرا دیتا ہے اس لئے کہ یہ انسان جن کی روح ابھی تک آزاد نہ ہو سکی۔ آزادی لے کر کیا کریں گے، جبکہ وہ آزاد اقوام کے کردار کو اپنا نہ سکے اور ان کے دل و دماغ پر کینہ، جفاشعاری، عداوت، حسد، بغض، نفرت، وحشت اور بربریت کا تسلط ہے:۔

یہ خنجر کیں کیوں ہے، یہ تیغ جفا کیوں ہے
یہ جبر و تشدد کیوں، یہ زعم حکومت کیا
ہر بول عداوت کا، ہر چال خصومت کی
کیا شورش نفرت ہے، یلغار ہلاکت ہے
یہ دور ہے وحشت کا، یہ دور ہے وحشت کا
ہاتھوں میں غلاموں کے آزادی کا پرچم ہے

اس کا حساس دل و فور جذبہ سے معمور ہو جاتا ہے اور زبان بے زبانی سے کہہ اٹھتا ہے:

بے نور یہ آنکھیں ہیں، یہ دل بھی ہے نابینا
مجبوری و محکومی، اک بوجھ ہے اب جینا

شاعر کا فلسفہ ہے، زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔ اسی نظریہ کے تحت وہ انسان کی چیرہ دستیوں کو یاد کر کے بیتاب ہو جاتا ہے اور بار دگر ماضی کی طرف لوٹتا ہے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ان بھولی ہوئی پیاری پیاری یادوں کا سہارا لیتا ہے۔ اے میری حسین یادو! آکاش پہ تم چمکو۔ اس لئے کہ:

وہ بھولی ہوئی یادیں، گر دل میں سما جائیں
اس خشک رگِ جاں میں پھر جان سی پڑ جائے
دل سینے میں پھر دھڑکے، اک شعلہ بھڑک اٹھے
خاشاک کے ڈھیروں میں جو آگ لگا ڈالے

اس کو یقین ہے کہ وہ بھولی ہوئی یادیں اب بھی تازہ ہوں تو ازسرِ نو عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑ جائے اور ان خاشاک کے ڈھیروں میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے، شاعر اک نئی دنیا بنانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، جہاں آدمی آدمی ہو، جہاں خیر و شر کی تمیز باقی رہے۔ خیر کی حکمرانی ہو اور محبت کا بول بالا ہو، محبت، یہی تو اکسیرِ درد ہے۔ وہ اس دنیا کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ جلا دینا چاہتا ہے، تاکہ اک نئی دنیا آباد ہو، جو محبت کو مادی ہوتے ہوئے بھی دائمی اور ابدی بنا دے۔ انسانی زندگی کا تسلسل یہی چاہتا ہے۔ یہاں کی تخریب خود ہی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہے، اس نیرنگ زار جہاں میں ہستی اپنی بربادی کے سامان خود فراہم کرتی ہے اور خود ہی اپنی آبادی کے لئے بھی راہ ہموار کر لیتی ہے۔ یہی دستور ہے اور برابر رہے گا:

بجلی کی طرح تڑپو، دنیا کو مٹا ڈالو
پھر ایک نئی دنیا، اس راکھ میں پرچھا ڈے

جو حسن کی دنیا ہو، جو خیر کی دنیا ہو
جو درد و محبت کو ہر دکھ کی دوا جانے

سچ ہے:

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت ہی سارے زمانے میں ہے
محبت مسبب، محبت سبب
محبت سے ہوتا ہے کار عجب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں فونکس (PHOENIX) چڑیا کا تصور ہے۔ اس چڑیا سے دنیا کو تشبیہہ دینا بھی اس کی رمز نگاری کی دلیل ہے۔ یہ چڑیا خوب گاتی ہے اور دن رات گائے جاتی ہے۔ جب اس کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے، تو اس کی آواز سے گرم گرم آواز کا ایک شعلہ ابھرتا ہے اور وہ اسی شعلہ میں جل جاتی ہے۔ پھر اسی راکھ سے دوسری چڑیا پیدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ قائم رہتا ہے، یہ ہے زندگی کا تسلسل اور اسی کا مژدہ کہ قہر و جبر سکون اور آرام سے بدل کر رہے گا۔

اس نظم میں دوسرا اور تیسرا ٹکڑا نفس مضمون سے کچھ علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ دراصل نظم میں نظم ہے۔ اگر ان دونوں ٹکڑوں کو حذف کر دیجئے، تو نظم مکمل ہو جائے گی۔ رمزیت کی تہیں اور دبیز ہو جائیں گی۔ ان دونوں ٹکڑوں نے اس نظم کی ایک سمت متعین کر کے اس کو محدود کر دیا ہے اور شاعر کو حال کا پابند بنا دیا ہے۔ مگر خیالات ایسی روانی سے ادا ہوئے ہیں اور بات میں بات اس طرح نکل آئی ہے کہ ان دو ٹکڑوں میں کہی ہوئی بات بیگانہ بات نہیں

بنا کے رہ جاتی۔

یہ پوری نظم پڑھ کر ہمیں ورڈسورتھ کا ایک سانیٹ یاد آتا ہے جس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

Whence that low voice ?
a whisper from the heart
That told of days long past,
where have I roved
With freinds and kindred
tenderly beloved

ورڈسورتھ نے اس نظم کو قدرت اور فطرت کے انکشافات کا ذریعہ بنایا ہے اور کلیم صاحب نے اپنی نظم میں قدرت اور فطرت کے ساتھ ساتھ محبت اور انسانیت کو بھی محل التفات بنایا ہے جس سے ہر نظریہ کے رکھنے والے آدمی کو آجکل کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے۔

آخری ٹکڑے میں 'پر جھاڑے' کا لفظ کتنے اچھے معنی میں مستعمل ہوا ہے، لیکن ذیل کے شعر میں یہی لفظ مہانت کھو دیتا ہے۔

باقی ابھی ہے رات نہ گھبرائیے حضور
پر جھاڑتے ہیں، مرغِ سحر بولتے نہیں

یہاں پر دو الفاظ مجھے ذرا ثقیل معلوم ہوتے ہیں، تموّج اور یلغار۔

ذکر میں ان شاء اللہ دوسرے موقع پر کروں گا۔ رہ گیا یہ سوال کہ شعر کیا ہے اور اس کے لئے قافیہ و ردیف کا التزام ہونا چاہیئے کہ نہیں، اس پر میں اپنی کتاب علم العروض مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں روشنی ڈال چکا ہوں۔ اس پر مزید بحث بھی ان شاء اللہ دوسرے موقع پر کی جائے گی۔

یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ کلیم صاحب نے ہیئت ترقی پسند ادب سے لی اور معنویت غزل سے، اور ان دونوں کو مغربی کسوٹی پر کس کر اردو میں ایک نیا اور انمول تجربہ پیش کیا۔ ترقی پسند تحریک سے یہ متاثر ضرور ہوئے۔ مگر ان کی اچھی باتوں کے لئے۔ یہ نہ کبھی اشتراکی پسند رہے اور نہ کبھی ہو سکیں گے۔ ان کا ادب ذاتی یا اجتماعی پروپگنڈا نہ بنا ہے نہ بنے گا۔ لیکن وہ اس ادب کے انوکھے انداز بیان سے تاثر لئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے پیٹ اور روٹی کی ہم نہ چلائی۔ مذہب اور مذہب کے معتقدات پر شکوک و شبہات کے تیر نہ چلائے، سوسائٹی کی عصمت لوٹنے کی فکر میں نہ رہے۔ کسی اثر سے متاثر ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس کا اثر لیا۔ اس کی چھاپ اپنے کلام پر ڈال لی، دوسری یہ کہ جس سے اثر لیا اس کی برائیوں کو کاٹ چھانٹ کے اچھائیوں کو دامن میں سمیٹ لیا۔ آخر الذکر طریقہ ادیب کی اختراعی صلاحیتوں کی بدولت وجود میں آتا ہے۔ کسی نے لقمان سے پوچھا تھا کہ تم نے عقل کس سے سیکھی۔ اس نے جواب دیا، بے عقلوں سے، یہی حال کلیم صاحب کا ہے کہ انہوں نے انہی بے عقلوں سے عقل سیکھی اور انہی شاعری کو خارج کرنے والوں سے اپنی شاعری کو جان دار بنانے کے آداب۔

کلیم صاحب نے اپنی کتابوں میں ترقی پسند شعراء، اقبال، نظیر اکبر آبادی اور میر اثر پر خاص توجہ دی ہے، یہی دلیل اس امر کی ہے کہ وہ ان شعراء سے گہرے طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ اول الذکر دو کے اثرات ۴۲ نظموں میں نمایاں ہیں، انہوں نے بڑی دانشمندی

(۳۴) یہ چھوٹی نظم کل ۳۴ مصرعوں سے بنی ہے، کلیم صاحب کی اور نظموں کی طرح یہ بھی مختلف تجربات کو برافگندہ نقاب کرتی ہے۔ یہ ایک منظری نظم ہے جس میں فطرت کا نکھار اور زبان حال سے اس کی پکار کا برملا اظہار ہے۔ ابتدائی چند مصرعے اقبال کی یاد دلاتے ہیں، یہاں دریا کا سکوت دست صبا نے گدگدا کے ختم کر دیا ہے اور اقبال نے اس سکوت کا مسلسل نقشہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کلیم صاحب یہاں دریا کا سکوت توڑ کر سورج کی کرنیں بکھیر کر، آسمان کی تاریکیوں کا پردہ چاک کر کے ادائے مطلب کے لئے ایک پس منظر پیش کرتے ہیں، ہمہ اوست اور ہمہ از وست کے رازہائے سربستہ کو فطرت کے سہارے منکشف کرنا چاہتے ہیں، ان کو تعجب ہے کہ جب وہ حسن ازل ہر شے میں پیدا و پنہاں ہے، وہ باغ وراغ میں ہے، وہ پھول کی مہک میں ہے، وہ بجلی کی چمک میں ہے، شبنم کے آنسوؤں میں ہے۔ کلیوں کے تبسم میں ہے، پانی کی روانی میں ہے، پروانہ کے سوز نہاں میں ہے، پھر وہ روپوش کیوں ہے، وہ ہم سے قریب ہوتے ہوئے بھی ہم سے دور کیوں ہے، یہ ہماری تقصیر ہے یا اس کی کم التفاتی، ہر چہار طرف تباہی ہے، الحاد ہے، بیدینی ہے، کرب و اضطراب ہے، آدمی سے آدمیت چھن گئی، نور سے نور چھن گیا، حوادث کے طوفان آرہے ہیں، سارے مناظر قدرت پر ایک ہیجان اور غصہ کا عالم طاری ہو گیا ہے، بداخلاقی کی بجلیاں چمک رہی ہیں عصیان و نافرمانی کے کڑکے سامعہ کو بہرا بنا رہے ہیں اور شاہد ازلی اپنے حسن و عشق اپنی صورت اور سیرت کو مسخ کر رہا ہے،

تاریکیوں کے دستے ہر سمت بڑھ رہے ہیں

فوجِ یزید گویا یلغار کر رہی ہے
حسنِ ازل کدھر ہے! روپوش ہو گیا ہے

روپوش اس لئے کہا جا رہا ہے کہ دنیا تاریکی کے غار میں گم ہوئی جا رہی ہے، وہ حسنِ ازل خود ہی ظلمت میں پنہاں ہوتا جا رہا ہے، آخر یہ ظلمت ہے کیا اور کیوں اس کی جرأت ہی ہوئی کہ نور کو سراپا سرمدی نور کو اپنے اندر سمو لے، آخر ہر نور کی انتہا ظلمت ہے اور اس کی ابتدا ظلمت ہے، وہ حسنِ ازل بھی ظلمت ہی سے بنا تھا۔ اس لئے اپنے اصل کی طرف عود کر گیا، آخر میں ان کی مستفسرانہ ذہنیت چمک جاتی ہے اور اس خاکدان میں اجتماعِ اضداد پر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

ہستی کا دل ہے ظلمت، ظلمت میں نور کیوں ہے
کانٹوں میں پھول کیوں ہے، مٹی میں جان کیوں ہے
شاہیں ہے کیوں ہوا میں، آب و سراب کیوں ہے
سازِ عدم میں پنہاں، سوزِ حیات کیوں ہے

شاعر اس گتھی کو سلجھانا چاہتا ہے کہ آج کل عالم میں تاریکی ہی تاریکی کیوں ہے اور کسی زمانے میں یہی دنیا پُر نور اور ضیا بار کیوں تھی؟ وہ کیسے انسان تھے اور یہ کیسے انسان ہیں، کیا انسان بدل گیا، اس زمانہ کا خدا کون تھا اور اس زمانہ کا خدا کون ہے؟ کیا خدا بھی بدل گیا؟ نہیں بدلا، تو پھر یہ بدلی ہوئی نظر کیسی، بدلے ہوئے تیور کیسے:

چہرۂ نور پہ یہ پردۂ ظلمت کیوں ہے
یہ اُجالے کو اندھیرے کی ضرورت کیوں ہے

(۳۵) اس نظم میں ۳۰ مصرعے ہیں، اس کو شاعر نے چھ حصوں میں بانٹا ہے، ہر حصہ ارتقائے خیال کی طرف لے جاتا ہے، پہلا ٹکڑا اس کا مرکزی خیال پیش کرتا ہے، انعام حیات کی ناہمواری اور تقسیم زر کی عدم مساوات، تقدیر کی بالادستی اور تدبیر کی بے بسی ایک خوشگوار انداز میں پیش ہوئی ہے۔

خمِ گیسو ہے کہیں، طرۂ پیچاں ہے کہیں
چشمِ جادو ہے کہیں، پنجۂ مژگاں ہے کہیں
دام پہ دام ہے، زنجیروں پہ زنجیریں ہیں
دلِ معصوم ہے اور سینکڑوں تعزیریں ہیں
اس کو صیاد کے پنجوں سے نکالے کوئی

اقبال نے دنیا کے ہنگاموں سے گھبرا کر ایک نیا شوالہ بنانا چاہا تھا، غالب نے دنیا کے جھمیلوں کو بھول جانے کے لئے ایک ایسی جگہ مقام کرنا چاہا جہاں "ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو"۔ ڈبلو۔ بی۔ ایٹس W.B.YEATS نے عالم کون و مکان کے شر و فساد سے دور رہنے کے لئے اپنی دنیا اپنا ایک جزیرہ آپ بسانا چاہا۔ کلیم صاحب بھی اس جہان رنگ و بو کے انداز جنوں سے گھبرا گئے ہیں۔ آئے دن انسان، انسان سے ٹکرا رہے ہیں، کہیں مذہب کے نام پر، کہیں وطن کے نام پر، کہیں زبان کا بہانہ تراش کر، کہیں بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے کی خاطر کبھی آدمی کو سرمایہ داری کا محکوم بنانے کے لئے، کبھی اس سرمایہ داری کو مٹا ڈالنے کے بھوت کے زیر اثر، غرض طرح طرح کے بکھیڑے ہیں۔ جن سے معصوم دل ہر روز ایک نئے شکنجہ میں کستے چلے جا رہے ہیں اور انسان انقلابات کی چکی میں پس رہا ہے

اس کی رگ رگ ٹوٹتی جا رہی ہے۔ مگر فطرت مادر فطرت کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں۔

یہ شب و روز کے بڑھتے پھیلتے ہوئے ہنگامے، یہ شر اور فساد، خوں ریزیاں، جبر و تشدد، معصوم لہو سے دن رات نہانے کا مشغلہ دیکھ کر ایک حساس انسان کی رگِ احساس بھڑک جاتی ہے، دستور زباں بندی نے استعارے کی زبان پیدا کی، وہ دنیا والوں کے خرافاتی انداز فکر سے بیزار ہے۔ اس کو یقین ہو گیا ہے کہ اس درد کا مداوا نہ مذہب کے پاس ہے، نہ سائنس کے پاس، اس دردِ دل کا علاج اگر ممکن ہے، تو انسانیت سے، اخلاق عالیہ سے، اسوہ حسنہ سے، مسجدوں کے امام سوز دروں سے محروم ہو چکے ہیں۔ مندروں میں برہمن بُت خانوں کے دروازے تک ہی آ کر رک گئے ہیں، پیران کلیسا عصائے اخوات سے بیگانہ ہو گئے ہیں، ہر شخص اپنے طور پر خدا بنا رہا ہے، شاعر ان سب جھگڑوں جھمیلوں کو چھوڑ دینے کی تلقین کرتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ خبردار اشتراکی نہ بن جانا، اور نہ سرمایہ داروں کے زرّیں طوق پہن لینا، غلامی سے آزادی کو بدل نہ لینا کہ آزادی انسانیت کی واحد امانت ہے:-

لال پرچم نہ خبردار بناؤ دل کو
طوق زرّیں کے بھی پھندوں سے بچاؤ دل کو

اب ضرورت ہے کہ دل میں کے مندر میں نئی شمع جلائے کوئی۔ انسان تو مرد کامل ہے، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، وہ عالم آب و گل میں کیوں مقید ہے وہ انسان بنے، نائب یزداں بنے، زمین سے اونچا اٹھے اور آسمان کو تاکے

خورشید سے آنکھیں ملائے، چاند کو دیکھے، شعلۂ طور کو اپنائے اور اس طرح فضائے عالم پر چھا جائے اور کسی طرح ایک نیا شوالہ بنا ڈالے کہ اسی پر اس دنیا کی فلاح و بہبود منحصر ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اس کے تصورات آزاد ہوں، اس کی فکر بلند ہو، اتنی بلند کہ گبریل جبرئیل درماندہ و شکستہ بھی ہو جائے تو اسے قوتِ پرواز عطا کرے، جب ایسا ہوگا، تب ہی انسان عوارضِ دنیوی سے، عصبیات آب و گل سے نجات پا سکے گا۔ وہ زمین کا پابند نہ رہ کر گنبدِ مینا پہ سوار ہو سکتا ہے اور عرشِ بریں کا ایک درخشاں ستارہ بن کر پھر چمک سکتا ہے۔

چاند کو دیکھو، کبھی زہرہ پہ ڈورے ڈالو
کبھی مریخ کو تاکو، تو زحل کو جھانکو
مشتری لاکھ منائے، پہ منائے نہ منو
کبھی اس جلوۂ خورشید سے آنکھیں سینکو
شعلۂ طور کو آنکھوں میں بٹھائے کوئی

یہ چھوٹی سی نظم ایک پُرسکون ماحول سے شروع ہو کر، دھیرے دھیرے ارتقا کی طرف چلتی ہے اور پھر عروج تک پہنچتی ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک پُرسکون اور سنجیدہ دنیا کس طرح شر اور فساد کی طرف مائل ہو گئی اور کیسے کیسے انسانیت سوز مظالم وجود میں آتے رہے۔ چوتھے اور پانچویں ٹکڑے میں ایک انسان کا ردِعمل ہے۔ اس انسان کا جو انسانیت کا علمبردار ہے، جو ساری قید تعینات سے علیحدہ ہو کر آدم کو، آدم کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے وہ فکر رسا اور فکر آزاد کی تعلیم دیتا ہے، کہ اسی انداز تصور اور

اسی سلیقہ حیات سے زندگی کے پنپنے کی راہیں کھل جاتی ہیں اور انسان اسی طرح اس عالم امکان کو زیر کر کے فضائے بسیط پر حکمرانی کرنے کا اہل ہو جائے گا۔

(۳۶) ۲۱ مصرعوں کی یہ سادہ لیکن پر کار نظم جذبیات کے تلاطم سے بھری ہوئی ہے، معنوی طور پر اس کو بھی غزل ہی کہئے۔ مگر غزل میں روایتی مضمون اکہرا تاثر پیش کرتا ہے، اس نظم میں جو اثر ہے وہ تجربات کی بنا پر ہے، شاعر کے دل میں اس کے محبوبہ کی یاد خون بن کر سما گئی ہے، اس کی قوت متخیلہ ماضی کی طرف بے پناہی کی حالت میں دوڑتی ہے۔ جذبہ کی تحریک اس تجربہ سے ہوتی ہے کہ دنیا میں جس طرح کے شر و فساد برپا ہو رہے ہیں اور جتنے فتنے بیدار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ہر ذی حس انسان کے شعور کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا ہے اور ہر ذی فہم ہستی بیدار ہو گئی ہے، — مگر شاعر کی محبوبہ تو فہم رسا اور طبع ذکی رکھتی ہے۔ وہ کیوں ابھی تک خواب گراں میں ہے، — وہ کہہ اٹھتا ہے:

یہ خواب ناز کب تک، اے مست ناز دیکھو!

معاً اس کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ وہ یہ کیا بک گیا:

کیسے وہ اٹھ کے آئے وہ دور سو رہی ہے
دنیا کے درد و غم سے آزاد سو رہی ہے
فتنے ہزار اٹھیں، یہ آسمان ٹوٹے
اس کی جبیں پہ لیکن کوئی شکن نہیں ہے

حقیقت کی اس لہر کے ساتھ ہی شاعر اپنی حسین دنیا کی طرف لوٹ جاتا ہے ماضی کی یاد کے چند نقوش اس کے ذہن پر ابھر جاتے ہیں اور کسی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہ رنگ و بو کی تتلی، خوش رنگ پیاری، جس کی شرمگیں نگاہوں

اور سرمگیں آنکھوں نے اس کے دل میں پائیدار و لازوال جگہ بنالی ہے:

پھولوں سے وہ بنی ہے، تاروں میں وہ پلی ہے
میں اس کو چاہتا ہوں، وہ مجھ کو چاہتی ہے

شاعر کا دماغ پھر حقیقت کی ٹھوکر کھاتا ہے۔ یہ خیال اس کو مجروح کر رہا ہے کہ اس جانِ محبت نے تربت میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ وہ اسے مردہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کی آنکھیں اس کو صاف دیکھ رہی ہیں۔ اس کا دل ابھی تک اسی کی یاد میں تازہ و شاداب ہے۔ وہ اس کی ایک ایک ادا کو، اس کے حسین مجسمے کو صاف دیکھ رہا ہے، اس لئے وہ کچھ جھنجھلا جاتا ہے، کہ لوگ اسے مردہ کیوں کہتے ہیں:

یہ جھوٹ ہے، غلط ہے، تہمت ہے، افترا ہے

پھر شاعر پر اپنی حقیقت منکشف ہوتی ہے اور وہ کہنے لگتا ہے:

میں کیسے بھول جاؤں، کیسے اسے بھلاؤں
وہ نور ہے نظر میں، وہ خون ہے جگر میں
دل میں تڑپ اسی سے، جاں ہے اسی سے تن میں
وہ میری زندگی ہے، دنیا کی زندگی ہے

یہاں شاعر اپنے کئے ہوئے پیمان و عہد وفا کو دہراتا ہے۔ دل ہی دل میں دہراتا ہے اور اسے نہ بھول جانے کا ایک جواز بھی نکال لیتا ہے۔ اس کی محبوبہ شاعر کی زندگی، بلکہ ساری کائنات کی زندگی ہے، یہاں غمِ جاناں کو آزار جاں بنا کر پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ غمِ جاناں نے اسے کیف حیات سے سرشار کر دیا ہے۔ وہ پتھر سے سر پھوڑنا، خراجِ محبت نہیں جانتا۔ وہ جنگل جنگل کی خاک چھاننا بھی

تقاضائے محبت کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس نے اپنے محبوب کو اپنی زندگی بنا لیا ہے۔ اس کو اپنی زندگی سے دلچسپی ہے بلکہ ساری کائنات کی زندگی سے دلچسپی ہے وہ ایک حقیقت پسند اور ساتھ ساتھ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان کی طرح دنیا کے مشاغل سے بھی دل بہلاتا ہے اور اپنی فرصت کے لمحات میں اپنی وفا کا ثبوت بھی دیتا رہتا ہے:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ورڈسورتھ نے لوسی Lucy کی موت پر کچھ اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے:

O' Mercy ! to myself I cried
'If Lucy should be dead'

But she is in her grave, and, oh,
The difference to me.

یہ چھوٹی سی نظم 'از دل خیزد، بر دل ریزد' کی اچھی مثال ہے۔ خیالات و جذبات کے تلاطم کے باوجود حسن شعری سے بے توجہی نہیں برتی گئی ہے۔ تخیل کا رنگ گہرا ہے اور حقیقت کی لہریئے ہوئے۔ سادگی، دلفریب سادگی، ترنم موثر ترنم سے یہ خود کلامی بھری ہوئی ہے

(۳۷) دست قدرت ہے خام کا ایسے
اپنی قدرت پر اختیار نہیں

یہ ہیں ابتدائی دو مصرعے اس چھوٹی سی نظم کے جو ۲۶ مصرعوں پر مشتمل ہے، یہ پوری نظم اقبال کے اس شعر کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے:۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل ترا، نقش ہے ناتمام ابھی

آغاز سے چار ٹکڑے دنیا کی بے ثباتی اور نقشہائے ہستی کی ناپائیداری تبا رہے ہیں۔ بلکہ ایک نئی بات کا اضافہ ملتا ہے اور وہ ہے ردعمل فنا کی شدت احساس کا:

شعر ہو، عشق ہو کہ حسن ازل
ایک بھی نقش پائیدار نہیں

یہاں کی بہار بھی خزاں کا ایک نقش ہی ہے:

ہے ہوائے خزاں بھی دامنگیر
شاخ بے برگ، پھول نقش غبار
حسن صد رنگ کی ہے یہ تعبیر

شعر و سخن کو لافانی اور آب حیات جاودانی کا سرچشمہ کہا جاتا ہے لیکن فنا کے تیکھے اور تند احساس سے ہر شعر کو گرچہ وہ چشمۂ حیواں ہے۔ ایک مٹی مٹی سی تحریر کہہ کر دنیا کی بے بضاعتی اور کم فرصتی کو ذہن نشین کرا دیا گیا ہے۔ یہ نظم اس گذشتہ نظم کے ساتھ ہی پڑھی جائے تو اسکی معنوی کیفیت اور بھی گہری نظر آئے:

یہ پوری نظم ایک شکوہ ہے، شکوہ امیدوں کا سرچشمہ ہے، امیدوں ہی سے شکوہ کی آبیاری ہوتی ہے۔ ورنہ:

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

شاعر کو دست قدرت سے، اس قادر مطلق سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ مگر ایک ایک امید مکڑی کے جال کی طرح بکھر گئی۔ شاید قدرت خود ہی مجبور ہو رہی ہے ورنہ ہر نقاش کو اپنے نقش سے محبت ہوتی ہے اور اس کی زیبائش و آرائش میں نقاش اپنے چہرے کی درستگی دیکھتا ہے، دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ مگر انسان تقدیر کا کھلونا ہے، فانی ہے، بے بس ہے، مجبور ہے، دنیا کا ایک نقش بھی استوار نہیں، یہاں کسی رنگ کو قرار نہیں۔ اس لئے کہ آن کی آن میں ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے، بھلا ایسی ہستی کا اعتبار کیا کیجئے۔ شاعر مبالغہ اور غلو سے برابر دامن بچاتا رہا ہے، یہاں ہستی کو وہ بے اعتبار ہی کہتا ہے۔ موہوم نہیں کہہ جاتا، وہ ہستی کو ہستی ہی سمجھتا ہے، اسے نیستی نہیں کہتا۔ ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے۔ آج بہار ہے، تو کل خزاں۔ حسن ہزار رنگ بھی ایک نہ ایک دن اپنی کشش کھو دے گا۔ اس لئے آج کل سب کو مرنا ہے كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (دنیا کی ہر جاندار شئے فانی ہے) لیکن فنا کے اس نقشہ کو بڑا ہی نشاط انگیز طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کو ایسا خوشگوار بنا دیا گیا ہے کہ زندگی قابل نفرت بن کے نہیں رہ جاتی۔ اس لئے کہ اس کو یقین ہے۔ یہ خام کاری قدرت پختہ کاری سے بدلیگی، عشق کی بے اعتباری اعتبار سے بدلے گی۔ انسان مجبور ہے، تو اب مختار ہوگا۔ وہ منتظر ہے کہ وہ دن کب آئے گا، جو دن آنے والا ہے، وہ دن اسی دن آئے گا جب یزداں اور انسان میں صحیح رشتہ کا پتہ چل جائے گا جب ہی حسن پختہ کار ہوگا، عشق پائدار ہوگا، شعر سازگار ہوگا اور جبر پر اختیار ہوگا۔ اور ہم سب یبقیٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ کی تلاوت کر کے اپنی اپنی بقا کی ضمانت پیش کریں گے اور شاعر آنی اور فانی ہستیوں کو پائندگی

ہے اپنی شاعری میں کفر و اسلام کو ایک دوسرے میں ضم کر دینے کی کوشش کی ہے، کہ انسانی مسرت اور حیات کی استمراریت کا راز متضاد اور متعاند رجحانات کی یک آہنگی میں مضمر ہے، یہ متعاند رجحانات انہیں جوش امنگ اور قوتِ حیات عطا کرتے ہیں اور کبھی کبھی اندرونی تصادم سے بھی آشنا کر دیتے ہیں اور یہ لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ۔

اُردو شاعری میں اصلاح کا احساس سب سے پہلے آزاد کو ہوا، مگر وہ اپنی کم علمی کے باعث انگریزی کے بیش بہا خزانوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ حالی نے بھی قافیوں اور ردیفوں کی قید و بند سے آزاد رہنے کی تلقین کی مگر کوئی نئی دنیا قائم نہ کر سکے۔ بلکہ خود بھی وہی پرانی لکیر پیٹتے رہے۔ اسماعیل میرٹھی نے چند ہلکی پھلکی نظمیں لکھ کر اس کے تجربے کئے، کامیاب بھی ہوئے۔ مگر تجربوں میں آفاقیت اور مشاہدوں میں گہرائی نہ ہونے کے باعث ان کی نظمیں وقتی راگ ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے کچھ انگریزی سے منظوم ترجمے بھی کئے، جو نسبتاً پائدار ثابت ہوئے۔

ہندوستان میں آزاد نظم اور نظم معریٰ لکھنے کا رواج طباطبائی کی بدولت چل نکلا۔ اس کے بعد سے انگریزی نظموں کے ترجموں کا دور شروع ہوا۔ اس طرح کی نظمیں پہلے دلگداز میں شائع ہوتی رہیں، طباطبائی کی نظم 'بلینک ورس کی حقیقت' میں نظم معریٰ کو فطری شاعری کہا گیا۔ دیکھا دیکھی یہ رسم چل نکلی، شرر، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ اس طرح کے تجربے کرتے رہے، اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں سر عبدالقادر نے مخزن نکالا اور اقبال کی نظم 'ہمالہ' اس میں شائع ہوئی۔ جس سے اُردو شاعری کو ایک نیا امکان ہاتھ آیا۔ نادر کاکوروی مخزن کے صفحات میں اپنی اختراعی صلاحیتوں کا ثبوت دیتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں جب تاجور نجیب آبادی مخزن کے ایڈیٹر ہوئے تو یہ تحریک کچھ ابھری۔ لیکن دس سال بعد ۱۹۲۷ء میں جب وہ 'ہمایوں' کے مدیر ہوئے،

کے راز سے آشنا کرے گا:۔

اعتبار رات سے نہ کھیلوں گا
سیمیا سے نہ دل لگاؤں گا
جان آنی نگار فانی کو
راز پائندگی بتاؤں گا

یہ ہے امید فردا جو ہر پیغام گو شاعر کے دل کی آواز ہے۔ شاعر اپنے گرد انقباض، حسرت، یاس کا نرغہ دیکھتا ہے۔ لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ دیتا، اس کو پیغام حیات دیتا ہے اور وہ پیغام حیات دے گیا۔

قاصد آیا بھی سنا تا بھی گیا راز کی بات
منتظر دہ ہیں کہ آنے کو ہے پیغام ابھی

یہی انداز کلیمی ہے کہ بات کی بات میں کام کی بات کہہ گئے، مگر کبھی بناوٹ کی بات درمیان آنے نہ دی بلکہ ان کا پیغام شعری تجربہ بن کر ایک ایک شعر میں تحلیل ہو گیا ہے اور حسن شعری ہر ہر لفظ میں اس طرح پیوست ہو گیا ہے، جیسے گوشت میں ناخن۔

(۳۸) آسماں سے آتی ہے یہ صدا
اُٹھ باندھ کمر لے زاد سفر
چل دیکھ خدا کیا کہتا ہے

ان مصرعوں سے اس نظم کی ابتدا ہوتی ہے۔ جس خیال کی پیشکش ہوئی ہے۔ وہ ۳۸ مصرعوں میں ایک مکمل اور بسیط تجربہ بنکر نظم کے اجزاء ترکیبی کے ساتھ پیوست ہو گیا ہے۔ اس مختصر سی تمہید میں کلیم صاحب انسان کی فطری جستجو اور تحیر کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ انسان جس کو اس خراب آباد میں اپنی خرابی کا احساس کبھی کبھی بُری طرح ستانے لگتا ہے۔ وہ انسان اس پہلے عالم میں اس وسیع و عریض دنیا میں اس رنگ و بو کے گلشن میں کچھ اجنبی اجنبی سا معلوم ہو رہا ہے۔ احساس ابتری اور یقین محرومی اس کو زندگی کے ہر موڑ پر روک رہی ہے، اب اس کو مطلق اس پر اعتماد نہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ کا نائب ہے، اللہ کی صورت ہے مختلف شکلوں میں، ایسا کیوں ہوا؟ اس کی دریافت سے بھی وہ قاصر ہے مگر ایسا ہو گیا۔ خدا کا فرمان تو ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم اپنی حالت آپ نہ بدل لے) قوموں کی طرح افراد کا بھی وہی حال ہے۔

خلقت آدم سے تا ایندم انسان اپنے خالق تک رسائی کے لئے بیتاب ہے یہ جزو اپنے کُل میں ضم ہونا چاہتا ہے اور آدم اپنے خدا کو جاننا پہچاننا چاہتا ہے اس کی دو راہیں متعین کی گئی ہیں، ایک تو مذہب ہے، آج تک جتنے تجربے ہوتے گئے، سب مذہب کی مدد سے۔ اور ہم ابھی تک مذہب کی وساطت سے خدا کا کھوج لگانے میں مصروف ہیں۔ مگر ہمارے پلے کچھ نہ پڑا، صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور ہم طرح طرح کے اوہام باطلہ کے شکار ہو گئے۔ ہمارے دل میں مذہب کی خشک مزاجی نے خرافات کا زنگ لگا دیا ہم مزخرفات میں پڑ گئے، اب دور سائنس کا ہے، سائنس کی مدد سے عرفانِ رب کا وقت آگیا ہے، عرفان رب کے لئے عرفانِ نفس ضروری ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا) مذہب سے عرفان نفس حاصل تو ہوا، مگر یہ عجم کے خرافات میں کھو گیا۔ اور

یہ سالک مقامات میں کھو گیا، اس عرفان نے کبر و نخوت کے ساتھ ساتھ عبودیت کے رشتوں کو بھی مجروح کر دیا ـــــ اب مجبوراً سائنس کی طرف رخ کرنا ہے ـ سائنس چونکہ جذبات سے نہیں عقل سے سروکار رکھتی ہے ـ اس لئے ممکن ہے خدا تک جانے کی راہ عقل کی مدد سے نظر آ جائے:

مذہب کی بساط تعلیم کیا ہے سُنئے:

یہ دُنیا میں نے بنائی ہے
یہ رنگ و بُو کا گلشن ہے
یہ حسن و عشق کا خرمن ہے
یہ علم و عمل کا مسکن ہے

شاعر اللہ کی زبانی انسان کو پیغام دیتا ہے کہ یہ دنیا مزرعِ آخرت ہے۔ گرچہ یہ بڑی دلفریب اور دلبر ہے ـ بڑی پیاری پیاری ہے اس کا حسن اور اس کی دلفریبیاں ظاہری سکون کا موجب بن سکتی ہیں ـ لیکن باطنی سکون اور ابدی مسرت اسی وقت مل سکتی ہے کہ اس دنیا میں آرام نہ لیا جائے ـ اس ٹھنڈی چھاؤں میں نیند کا آنا لازمی امر ہے لیکن:

جو سوتا ہے، وہ کھوتا ہے
آرام نہ لے، آرام نہ لے

یہ دُنیا آرام کی جگہ نہیں ہے ـ آدم آسودگی سے آسودہ نہیں ہو سکتا خواب گراں سے بھی تباہ ہی ہو رہا ہے، از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز۔ انسان کو فطری جذبہ تلاش عطا ہوا اسے اس نادان نے گم کر دیا ہے، اسے عقل و خرد کی نعمت ملی ہے، وہ اپنی عقل و خرد سے کام نہیں لے رہا ہے ـ وہ

جامد و ساکت رہ گیا ہے۔ حالانکہ زندگی نام ہے حرکت کا:

جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اُٹھ ہوش و خرد کو کام میں لا
تو رقصِ شرر ہے پتھر میں
تو سوز ہے سازِ ہستی میں
تو جان ہے جانِ عالم ہے
اس خاک میں تو آرام نہ لے

مجبور انسان کا آخری سہارا مذہب ہے اور دکھ درد میں برابر یاد آنے والا خدا ہے۔ مگر یہ دنیائے دوں، اللہ کی پناہ، یہاں کسے آرام ہے۔ ہر متنفس چکّر میں ہے، ہر شے چکّر میں ہے، دریا کی موجیں چکّر میں ہیں، صحرا کے بگولے چکّر میں ہیں، شاہیں اس خاکدان سے دور فضاؤں میں ہے، پھر بھی چکّر ہی میں ہے۔ جو شرارے زمین سے اُوپر کو اٹھتے ہیں وہ رخشاں تو ہیں۔ مگر وہ بھی چکّر میں ہیں۔ اس طرح چکّر نے ایسی زنجیریں پھیلا دی ہیں کہ انسان گھبرا جاتا ہے۔ مگر گھبرا کے اسے اپنا چکّر بھول نہ جانا چاہیئے کہ اسی چکّر سے وہ ساری خلاؤں کو مطیع کر سکتا ہے، وہ عرش پر کمند ڈال سکتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ رہا، تو پھر اس کی مفلوج مزاجی اسے بیکار کر کے رکھ دے گی، یہ نظم ایک طرح کا مکالمہ انسان اور خدا کے درمیان ہے۔ ذوقِ یقین اور شوقِ عمل کی ضرورت کو کس حسین تعمیری انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ہر ٹکڑے سے شعریت چھن چھن کر آ رہی ہے اور ان کے شرارے دامن میں سمیٹئے تو ایک لکیرِ عمل کی اور ایک جذبہ یقین کا لگاتار لپٹا چلا آتا ہے۔

مذہب نے انسان کو کیا نہ دیا، زمین دی، آسمان دیئے، جنت دی چاند تارے دیئے، باغ دیئے، پھول دیئے۔ فضائیں دیں، خلائیں دیں، مگران کے باوجود آرام نہ مل سکا اور اس سکون کے بھکاری کو سکون نہ ہو سکا، شاعر نے اس نظم میں اپنی شخصیت کو بہر نوع جدا رکھنے کی کوشش کی ہے اور الگ ہی رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر شئے اپنے دو پہلو رکھتی ہے اور انھیں متضاد پہلوؤں کو جمع کرنے والا انسان، انسان بنتا ہے۔ مذہب کے ذریعہ ان متعاند رجحانات کو ایک مرکز پر لانے کی اب تک کوشش کی گئی ہے۔ انسان ان بیجان اشیاء سے سکون اسی وقت حاصل کر سکتا ہے کہ وہ ان کی حقیقت کو پیش نظر رکھے۔ اوہام باطلہ کا شکار نہ بن جائے۔ مذہب کا کام واہمہ کا استیصال ہے۔ مگر یہاں مذہب نے واہمہ پرستی کی پرورش کی ہے۔ یہاں اوہام و خرافات مذہب کی بنیاد بن رہے ہیں — بہ ظاہر عرش بھی ہے، کرسی بھی۔ حور بھی، غلماں بھی۔ جن بھی، ملک بھی۔ جنت بھی دوزخ بھی۔ مگر انسان کی بدنصیبی سے ان سب کا تصور مسخ ہو گیا ہے۔

یہ کاخ و ایواں کیسے ہیں
یہ حور و غلماں کیسے ہیں
یہ جن و ملائک کیسے ہیں
جنت کیسی، دوزخ کیسی
اوہام کی دولت کیسی ہے

اب ضرورت ہے کہ سائنس ہماری مدد کرے۔ سائنس کیا ہے۔ اسی عقل و خرد کا عملی مظاہرہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو ودیعت کی ہے۔ اس لئے سائنس کی اگر خشیت ایزدی سے تہذیب اور تربیت کی جائے Discipline

تو پھر یہی سائنس واقعی انسانیت کی ہمنوا بن کے رہے گی۔ یہ دور سائنس کا ہے، سائنس کے انداز فکر سے مذہب کو اور خدا کو جاننے پہچاننے کی صورت نکالنی چاہیئے، کہ یہی صورت مثبت ہے اور پائیدار۔

آدم کی سرشت میں اربع عناصر کی آمیزش نے درد اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ لیکن یہ چاند، ستارے، یہ زرنار شعاعیں، یہ نیلی فضائیں، یہ نور کی شکلیں، یہ چمن کی بہاریں، یہ سورج کے دہکتے انگارے۔ یہ شعلے، افق میں پھولی ہوئی شفق کی لالی، پُر کیف کرنیں، بیجان ہیں۔ ان کے سینہ میں دل نہیں، وہ درد و اضطراب کیا جانیں اور جب تک کوئی متنفس درد و اضطراب سے آشنا نہ ہوگا وہ انسان کی اور انسانیت کی خدمت نہیں کر سکتا۔

ہاں چاند چمکتا ہے شب کو
پُر نور زمین کو کرتا ہے
بے نور مگر ہے اس کا دل

سورج ہے دہکتا سا شعلہ
کیا آگ کی بارش ہوتی ہے
کیا آگ کے دریا بہتے ہیں
کیا آگ کے طوفاں اٹھتے ہیں

یہ ہے سائنس کا انکشاف اور یہ ان عظیم تخلیقات کی حقیقت:

یہ شعلہ بھی بجھ جائے گا
تو دور سمجھتا تھا ان کو

حیرت سے انہیں تو تکتا تھا
یہ دیکھ ہیں تیرے زیرنگیں!

یہ چاند بے نور ہے، آفتاب کی روشنی چھن جائے گی، زمین کے ہنگامے ختم ہوں گے، سورج اپنا محور بھول جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب پر انسانی تسلط ہو گا، انسان باقی رہے گا، کہ اللہ کا مظہر ہے، اس کا خلیفہ ہے، اس کی روح ہے۔ اس کی آواز ہے، یہ فانی ہوتے ہوئے بھی فانی نہیں ہے، مگر یہ مناظر قدرت، یہ مہیب اور مرعوب کن مظاہر فطرت غیر فانی معلوم ہوتے ہوئے بھی، ذرے ذرے بنا کر بکھیر دیئے جائیں گے۔

سائنس کے زور پر انسان چاند کی حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے، اس کا راز جو ازل سے سربستہ اور پنہاں تھا آج خاکدان آب و گل کے رہنے والوں نے اس کو عریاں و بے نقاب کر دیا ہے۔ انسان چاند کو اپنی گذرگاہ بنا رہا ہے اور چاند اس سے ملول ہے ــــ "غرورِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں"

سُن! چاند یہ رو کر کہتا ہے
کیوں حسن یہ میرا چھین لیا
کیوں راز یہ میرا کھول دیا
یہ میرا ہی تو کرشمہ ہے
جو شعر کی دنیا روشن ہے
جو عشق کی دنیا روشن ہے

مگر چاند کے رونے دھونے سے کچھ نہ ہو گا، سائنس ترقی کر رہا ہے، اور ترقی کرتا رہے گا۔ اس کی حقیقت معلوم کر کے اس پر بھی حقیقی حکومت قائم کرے گا۔ اس طرح

نیابت الٰہی کے مکمل فرائض سنبھالنے کا اہل ہوگا:

ہمت ہے تو آ اور کھوج مجھے
اس کون و مکاں میں ڈھونڈ مجھے
یہ کیسی بھول بھلیاں ہے
ہر سمت خلائیں پھیلی ہیں
موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں
آ ڈھونڈ مجھے، آ ڈھونڈ مجھے

دنیا کی ساری مخلوقات زبان حال سے اپنی بے مائگی، اپنی بے نوری اور اپنی ویرانی کی کہانی کہہ رہی ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ غور سے سنے، یہ دنیا خیر اور شر کے تضادم سے بنی ہے، یہ کثافتوں سے بھری ہے، لیکن یہاں ظلمت اور نور ساتھ ساتھ پلتے ہیں۔ جو بلند ہے وہ پست بھی ہے۔ جو پست ہے وہ بلند بھی ہے۔ ہر خواب حقیقت ہے، ہر حقیقت خواب، یہاں یاس سے امید کی پرورش ہوتی ہے اور امید سے یاس کی شادابی ہوتی ہے۔

اضداد کہاں ہیں دنیا میں
دریا میں جو زیر و بم ہیں
تصویر کے گویا دو رخ ہیں
جو جوہر ہے، وہ عرض بھی ہے
تاریکی نور سے مشتق ہے
اور نور کا ظلمت مصدر ہے

سائنس نے یہی خزینہ علم عطا کیا ہے اور یہ بیش بہا تجربے انسان کو انسان

بننے میں ممد و معاون ہوں گے، وہ اپنی مایوسی سے مایوس نہ ہوگا۔ وہ اپنی ذلت میں عزت کی تخم کاری پائے گا۔ مگر اسے ہمت چاہیئے۔ وہ ہمت دکھا سکتا ہے کہ اس کے پاس دلِ دردآشنا ہے۔ وہ ذاتِ حق جس کی تلاش مذہب کے راستہ سے چل کر ہوئی اور اب سائنس کی راہ پر چل کر ہو رہی ہے، وہ تو اس کے پاس ہے اس کی رگ رگ میں ہے، اس کی چمک سورج میں ہے۔ وہ پُر نور فضاؤں میں منہ چھپائے ہوئے ہے، وہ عرش بریں پر ہے، وہ فرش زمیں پر ہے۔ وہ انسان کی ہر سانس میں دوڑتا رہتا ہے۔ وہ نزدیک ہے، بہت نزدیک، وہ دور ہے، بہت دور:

میں دور بھی ہوں، نزدیک بھی ہوں
ذرّوں میں دیکھ سمٹتا ہوں
سورج میں دیکھ چمکتا ہوں
میں سبزوں پہ شبنم بنتا ہوں
میں قوس قزح میں جھلکتا ہوں

اے انسان تو اسے کھوج نکال، اس علم کی دولت سے کام لے جس سے اس نے فرشتوں کو مات کیا تھا، اس عقل سے کام لے جس کا اظہار اس سے روزِ ازل ہوا تھا، اگر وہ کامیاب ہو گیا، تو پھر یزداں اس کا ہے اور وہ یزداں کا:

تو کھوج مجھے، میں تجھ سے چھپوں
تو پاس آئے، میں بھاگ چلوں
تو مجھ سے ملے، میں تجھ سے ملوں
یہ راز ہی رازِ ہستی ہے

تو عقل بنے، میں عشق بنوں
تو جسم سے چھوٹے، جان بنے
میں درد بنوں اور دل میں چھپوں
تو یزداں، میں انسان بنوں

حق یہ ہے کہ انسان کو انسان ہونا تو خیر آیا ہی نہیں۔ یزداں کو بھی یزداں ہونا نہ آیا، اس لئے کہ اسے انسان ہونا ابھی تک نہ آیا، ورنہ یہ سارے خرافات، یہ ساری حق تلفیاں، یہ ساری ناانصافیاں، مجبوریاں، حرماں نصیبیاں، دن رات کی گھڑکیاں، آئے دن کی تباہ کاریاں اور اداسیاں ختم ہو جاتیں:

"یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم"

اس لئے:

باہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنون مباش

اور یہی ہے سائنس کی ضرورت اور یہی ہے اس کی تربیت:

غالب نے مذہب اور مذہبی معتقدات کو تہ در تہ لبسیط اور مرکب بنا کر پیش کیا۔ کلیم صاحب نے مذہب کو عقل، علم اور سائنس کی روشنی میں قابل قبول بنانے کی کوشش کی ہے، یہ مذہب سے محبت کا نتیجہ ہے، نفرت کا نہیں۔ اب انسان تو عناصر فطرت کی تسخیر میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنی منزل سے قریب آ گیا ہے۔ اس پر فرض ہے کہ خدا، عبادت، خیر و شر، زندگی اور موت، عروج و زوال کے بارے میں اوہام باطلہ کی گرد سے دامن صاف کرلے، وہ عقل اور عقیدہ کی کشمکش میں نہ پڑے ورنہ:—

تو انہیں اپنی پالیسی اور اپنے پروگرام کو منظم طور پر بڑھانے پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اس سے پہلے عظمت اللہ خاں غزل کی پراگندہ فطرت، ریزہ کاری اور یاوہ گوئی پر ایک مفصل مضمون لکھ کر قافیہ پیمائی کا مذاق اڑا چکے تھے۔ انہوں نے عروض میں بھی انگریزی اصول کی پابندی کو سراہا تھا، یہ مضمون ۱۹۲۴ء کے اپریل والے شمارہ میں نقل کیا گیا تھا۔

یہ سارے لٹریچر کلیم صاحب کے مطالعہ میں ضرور آئے ہوں گے۔ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اُردو ادیبوں کی ایک فوج غزل کے خلاف صف آرا دیکھی۔ ان کا ماحول غزل کے چنداں مخالف نہ تھا۔ خود ان کے والد محترم علامہ عظیم الدین عظیم نے روایتی انداز کی غزلیں لکھیں اور روایتی سانچے سے الگ ہو کر بھی کچھ تجربے کئے، کامیاب تجربے۔ یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ ان کی جدید غزلیں اُردو ادب میں ایک صالح اور جدید قدروں کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ جدید غزل نگار کی حیثیت سے ان کا رتبہ اقبال سے کسی طرح کم نہیں ہوتا اور بہار میں شاد کے ساتھ ان کا نام نہ لینا ادبی جرم ہے۔ اس لئے کلیم صاحب بھی ابتدا میں غزل کی طرف میلان رکھا، لیکن رفتہ رفتہ اس سے اس طرح بیزار ہو گئے کہ جو کچھ نقوش ان کی غزل دوستی کے باقی بھی رہے تھے انہیں مٹا دیا، حرف غلط کی طرح مٹا دیا، کہ ان کی نگاہ میں اس طرح کی غزلیں ننگ شاعری تھیں۔ وہ شاعری کو محض ایک دلچسپ کھلونا یا ایک حسین زیور نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک شاعری، انسانی زندگی کا ماحصل اور اس کی تکمیل ہے، وہ رچرڈز، ایلیٹ اور لیوس کی طرح شاعری کی رفعت و وقعت کے قائل ہیں۔ اور شاعری کو فردوس آسودگی کا پیش خیمہ بتاتے ہیں۔ بھلا غزل کی قسم کی شاعری سے کس طرح وہ اپنی روح کو طمانیت عطا کر سکتے تھے اور ان کا بلند پرواز تخیل کب تک تنگنائے غزل میں بھٹکتا رہتا۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

اپنے جذبات کو دوسروں کی آنکھوں میں، اپنے محسوسات کو مخاطب کے دل میں اتار دینے کا سلیقہ کلیم صاحب کو بہ کمال ہے، مکرر، سہ کرر ایک ہی بات کو مختلف ڈھنگ میں اور اس کے ہر جزو کو دماغ میں اتارنے کے لئے تکرار الفاظ سے اچھا کام لیتے ہیں:

آنیلی فضائیں تجھ کو دوں
اپنی یہ خلائیں تجھ کو دوں
یہ چاند ستارے تجھ کو دوں
جوہر کے خزانے تجھ کو دوں

(۳۹) ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ نظم کل چھتیس مصرعوں سے بنی ہے اور ہر مصرع دوسرے مصرع سے ہر طرح پیوست معلوم ہوتا ہے۔ پوری نظم علامتوں سے بھری ہوئی ہے، شاعر اپنے مقصد کو چھپانے میں اور چھپا چھپا کر بتانے میں ہر طرح کامیاب ہوا ہے۔ اس کا فن بذات خود ایسا مسحور کن ہے کہ مقصد کا نشتر اسے چھیڑتا ہے، تو وہ اسے فن کے جادو سے سلا دیتا ہے۔ آخری مصرع:

کیسے ساقی ہو کہ غافل ہو، نگہدار ہو تم

ایک ہلکا سا، مگر تیکھا اشارہ مقصد کی طرف ہے، اس ٹکڑے میں ایک دھمکی ہے اقبال کے اس مصرع کی "بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے"۔

اور یہ مصرع: 'دشمن دیں ہے وہ، تم حیدرِ کرّار بنو' زحل کے ستم و ظلم کو دور کرنے کے لئے اشارت انگیز ہے:

بزم انجم میں چلو، شعلۂ رخسار بنو
برق شب تاب بنو، حسن شرر بار بنو

اس نظم میں یہ ٹکڑا ایک ہی بار آیا ہے، مگر دراصل یہی اس کا ابتدائی خیال ہے، یہی مرکزی خیال ہے اور یہی مقصود نظم ہے۔ غالباً یہ نظم جوشؔ کی نظم 'باغی روحوں کا کورس' کا جواب ہے۔

بڑھے چلو بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو
بہادرو وہ خم ہوئیں، بلندیاں بڑھے چلو
پے سلام جھک چلا وہ آسماں بڑھے چلو
فلک کے اٹھ کھڑے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو
یہ ماہ ہے، وہ مہر ہے، یہ کہکشاں بڑھے چلو
لئے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو
رواں دواں بڑھے چلو، رواں دواں بڑھے چلو

جوشؔ نے خود اپنی اس نظم میں 'نغمہ ساربانِ حجاز' سے خیالات چرائے ہیں بلکہ جذبات بھی، اقبالؔ کے یہاں تُند روی ہے۔ مگر شاعرانہ پابندیوں کے ساتھ، جوشؔ ہے مگر خلوص کے ساتھ اور جوشؔ کے یہاں خطابت ہے لیکن صداقت تجربہ ندارد یہ خلاف فطرت عشاہدات کا، خیالی مشاہدات کا، گھن گرج لئے ہوئے طوفان ہے، جس سے صرف ظاہر متاثر ہو پایا ہے اور باطن بے خبر ہی رہا۔ جہاں صرف الفاظ سے دلچسپ مشغلہ دکھایا گیا ہے اور معانی سے حیرت انگیز دوری۔

انھی باتوں کو جنھیں جوشؔ سامعہ پاش آوازیں سناتے ہیں - کلیمؔ صاحب ایک خاص سلیقہ سے سامعہ نواز بناتے ہیں - جہاں فن اور مقصد من تو شدم تو من شدی ہو کر رہ گئے ہیں - یہ کہا نہیں جا سکتا کہ مقصد جانِ شاعری ہے یا شاعری جانِ مقصد جمیلؔ مظہری نے بھی اس قبیل کی دو نظمیں لکھی ہیں - ایک نوائے جرس (کاروانِ انقلاب کے لئے) اور دوسری صدائے جرس (کاروانِ انقلاب کے لئے) دونوں نظموں میں، یہی انداز ہے:

بڑھے چلو بڑھے چلو، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، غرورِ کارواں ہو تم
جہانِ پیر کے لئے شبابِ جاوداں ہو تم
تمہارے حوصلے جواں بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

(نوائے جرس) ۱۹۳۳ء

نظامِ مہر و ماہ کے مزاج داں بڑھے چلو
ہیں ابر و باد و برق تم سے سرگراں بڑھے چلو
بدل رہی ہے کائنات تیوریاں بڑھے چلو
پکارتی ہیں منزلیں، نہ وہم ہے نہ خواب ہے
یہ دیکھو آفتاب ہے، وہ دیکھو ماہتاب ہے
بلا رہی ہیں دوریاں، بڑھے چلو بڑھے چلو

(صدائے جرس) ۱۹۴۳ء

قیاس یہ کہتا ہے کہ جوشؔ اور جمیلؔ دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے ہیں -

'صدائے جرس' جوش کے کورس سے زیادہ کامیاب ہے، اگرچہ درحقیقت یہ دونوں کے دونوں زمین ہی پر رہتے ہیں۔ لیکن باتیں آسمان کی چھیڑ دیتے ہیں۔ ایک آفتاب و ماہتاب کو دیکھتا ہے، دوسرا ان بلندیوں کو خم ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔ مگر دونوں ہی تخیل اس طرح کا پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ ہر نظم میں خیال ان کا ہم سفر ہے اور مقصد نے جذبہ بنایا ہے۔ جذبہ نے کوئی فنی مقصود پیش نہیں کیا۔

اب یہ بند ملاحظہ ہو:

چاند کہتا ہے: مری بزم سجاؤ آ کر
کب سے تکتا ہوں تمھیں آنکھیں ملاؤ آ کر
اپنی آنکھوں میں میں اک روز بٹھاؤں گا تمھیں
اپنے سینے سے میں اِک بار لگاؤں گا تمھیں
داغ دل دیکھو مرے درد کے غمخوار ہو

جوش نے بغاوت کا پرچم بلند کر کے روحوں کو عالم بالا کی سیر کرانی چاہی جمیل نے انقلاب لانے کے لئے آسمان کی باتیں کیں۔ مگر کلیم صاحب نے محبت کی آغوش میں، زہرہ کی زلفوں کے ساز میں، مشتری کے ناز و انداز میں، کہکشاں کے تاروں کی چھاؤں میں اور ساتھ ساتھ زحل کی لال لال آنکھوں کے سامنے، زمین سے آسمان تک کی سیر کی ہے اور ان باشندگان فلک کی ہمدردیاں حاصل کی ہیں:

مشتری کرتی ہے وہ دیکھو اشارے کیا کیا
مجھ سے کیوں روٹھے ہو، یوں دل سے بھلاتے کیوں ہو
میری آنکھوں سے اجی آنکھیں چراتے کیوں ہو
بھری محفل میں نہ شرمندہ کرو یوں مجھ کو

منّتیں کرتی ہوں میرے بھی خریدار بنو

انسان کی عظمت کا کیا کہنا وہ تو خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، انسان کا رتبہ خدا کی شان وہ تو بزم گیتی پر تصرف رکھنے والا ہے۔ مگر وہی انسان آج طرح طرح کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہا ہے، زمین جس کی ملک ہے، لیکن ملک ہوتے ہوئے بھی زمین جس سے گریزاں ہے، جو دنیا میں ہے مگر دنیا کی نعمتوں سے محروم ہے۔ مسرت اور چین یہی نعمتیں ایسی ہیں۔ جن کو زندگی کا انعام کہا جا سکتا ہے مگر آج کہاں یہ انعام کسی کو ملتا ہے۔ بڑا سے بڑا، چھوٹا سے چھوٹا اپنے اپنے دائرہ میں، برابر ہی مضطرب اور غمگین رہا کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس انسان کی قدر و منزلت، زمین والے نہ کرتے ہیں نہ کریں۔ انہیں چاند، زہرہ، مشتری کہکشاں اور دوسرے تارے سب کے سب بڑی عزت و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، سب انھیں زینت بزم بننے کی دعوت دے رہے ہیں۔ محبت کی دعوت دے رہے ہیں اور اس طرح دلوں میں، افسردہ و پامال دلوں میں امید فردا کے چراغ جل رہے ہیں۔ وہ امید فردا کی روشنی سے انسان کو محبت کرنے کی دعوت دے رہا ہے کہ محبت ہی پر ساری دنیا کی فلاح و بہبود منحصر ہے۔

کہکشاں کا یہ کہنا:

اپنے تاروں کی میں اک ہار پھاؤں گی تمھیں
کیسے بانکے ہو طرحدار، طرحدار بنو

یہاں پر بانکے کے لفظ نے خاص معنویت پیدا کر دی ہے اور انسان کی اس قوت کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے جس کا امین بن کر وہ عالم امکان میں آیا ہے۔ مگر قدم قدم پر امانت میں خیانت کرنے والے اور قوت کے باوجود ضعف کا احساس

دلانے والے، راستہ روک دیتے ہیں۔

ہاں زحل ایک عرف چیں بجبیں بیٹھا ہے
لال لال آنکھوں سے وہ دیکھو ڈراتا ہے تمہیں
گھڑکیاں کیسی وہ دن رات بتاتا ہے تمہیں
ذوالفقار اپنی اٹھاؤ، وہ نہ مانے گا کبھی
دشمن دیں ہے وہ، تم حیدر کرار بنو

یہاں پر لفظ گھڑکیاں، ذرا نامانوس معلوم ہوتا ہے، مگر کیا کیجئے کہ گھڑکیوں کے وقت آنکھیں لال لال ہو سکتی ہیں اور جب تیوریوں پر بل آتا ہے تو کوئی ضرور نہیں کہ اس کا گہرا اثر چہرے پر بھی پڑے۔

بزم گیتی کو سجو، غازۂ رخسار بنو
گردش ساغر مے ہے، مئے سرشار بنو
دل کے دلدار بنو، جان کے غمخوار بنو
کیسے ساقی ہو کہ غافل ہو، نگہدار بنو

یہاں شاید مراد ہے "کیسے نائب ہو کہ غافل ہو، نگہدار بنو، مگر مئے سرشار کی رعایت سے ساقی کا لفظ ہی آیا اور گردش ساغر کے انداز دکھلا رہا ہے، آخر میں یہ راز کھلتا ہے کہ اجرام فلکی کی عرف سے بزم انجم میں جانے کی دعوت کیوں دی جا رہی تھی۔ انسان محبت ہی بھول بیٹھا ہے، جو انسانی زینہ ہے۔ قرب خدا کا، وہ بغاوت کو اپنے سینہ میں چھپائے ہے، جو ابلیس کی نزدیکی کی علامت ہے، اور خدا سے دور کرنے کا ذریعہ۔ انسان خدا کا رقیب نہیں بن سکتا۔ وہ عین ذات خدا بن سکتا ہے، لیکن ابلیس، وہ تو رقیب ہی بن سکتا ہے

حبیب بنے سے رہا:

دل کے دلدار بنو، جان کے غمخوار بنو
کیسے ساقی ہو کہ غافل ہو، نگہدار بنو

(۴۰) چوالیس مصرعوں کی یہ چھوٹی سی نظم شاعر کے دلی کیفیات کو ماحول پر بکھیرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے باطنی کرب و اضطراب کو ایک کیف پرور انداز میں ہمارے سامنے لاتا ہے، وہ اپنے ماحول سے بیزار ہے، اس کا جی اداس ہے، اس کو تعجب ہے کہ اس کے اندرونی اضمحلال کا اثر مناظر قدرت پر کیوں نہیں پڑ رہا ہے، عروس فطرت اسی طرح بنی سنوری ہے، حسینان جہاں اپنی آنکھ کا جادو جگا رہی ہیں۔ باغ میں ہر سمت بہار کا منظر چھا رہا ہے اور اس کا زخم ہرا ہو رہا ہے۔ مگر وہ تنہا ہے، تنہائی کا احساس اس کو دیوانہ کر رہا ہے اور کہہ اٹھتا ہے:۔

توڑو ساغر و مینا
خم کو بھی لنڈھا ڈالو
روندو لالہ و گل کو
نوچ لو بہاروں کو!

اس لئے کہ وہ سوز نہاں سے پھنکا جا رہا ہے۔ یہ کلیاں چٹک رہی ہیں یا اس کی آرزوئیں کسک رہی ہیں۔ یہ بادل لپٹ لپٹ کر آ رہے ہیں، یا اس کی تقدیر اپنی بھیانک شکل دکھلا رہی ہے، وہ تو ایسی بہار میں آگ لگا دینا چاہتا ہے، ایسی بہار کے بال و پر نوچ لینا چاہتا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ:

جس سے آنکھیں روشن تھیں

جس سے دل کی رونق تھی
جس سے خوں میں گرمی تھی
جاں میں جان پڑتی تھی
مجھ سے کیوں وہ روٹھا ہے
دل سے کیوں بھلاتا ہے
اس کو میں کہاں ڈھونڈوں
کیسے اس کو میں پاؤں؟

اب جبکہ اس کا دوست، اس کا ہمدم، اس کا ہمراز، بلکہ اس کا رازِ حیات اس کی نظروں سے اوجھل ہے، وہ سارے سامانِ عیش کو توڑ پھوڑ کے رکھ دینا چاہتا ہے، وہ دیوانہ وار اپنے محبوب کی مختلف اداؤں کو یاد کرتا ہے اور دل مسوس کر رہ جاتا ہے، وہ غالب کی طرح خود فراموشی حاصل کرنے کے لئے شراب نہیں پیتا، مگر اس کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے، وہ اپنے من کی دنیا کا ہر آن جائزہ لے رہا ہے اور آپ ہی آپ کچھ بولتا جا رہا ہے، بیتے دنوں کی یاد ایک ایک کر کے اس کے تحت شعور سے ابھر رہی ہے، اور اپنے گرم گرم آنسوؤں کے تار سے اپنے تصورات کو مقید کرنا چاہتا ہے۔ مگر یہ تو آوارہ ہوئے جاتے ہیں اور اس کو بار بار اس کا شعور ہوتا ہے کہ وہ جس سے اس کے دل کی دنیا آباد تھی، دور، بہت دور چلا گیا ہے۔ اور اب تو یہاں کے باغ اور یہاں کے پھول سب بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں:۔ وہی رنگت گلوں کی ہے مگر کیوں بو نہیں آتی
یہ کیا اندھیر کر رکھا ہے اے بادِ صبا تو نے

وہ یاد کرتا ہے کہ اب وہ اپنے شعر کس کو سنائے گا اور اپنے شعر کس کی زبان

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

حلاوتِ نشان سے سُن سکے گا:

چاندنی میں غزلوں کو
کون گنگنائے گا

وہ جذبات کی رَو میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کو آج ایک ایک یاد بُری طرح ستا رہی ہے۔ اپنے محبوب کو مجسّم اپنے سامنے دیکھتا ہے اور زبان پر بے ساختہ آجاتا ہے:

کس کے لال ہونٹوں سے
پھول خار کھائیں گے
کس کے عارضِ روشن
بجلیاں گرائیں گے

شاعر نہ صرف اپنی دُنیا سے بیزار ہے۔ بلکہ اپنے آسمان سے بھی وہ الگ رہنا چاہتا ہے۔ یہ چاند تارے یہ آفتاب اسی کے تاباں چہرے کی یاد دلاتے ہیں اس لئے وہ اب ہوش کھو بیٹھتا ہے۔ وہ خیمۂ افلاک کو اُلٹ دینا چاہتا ہے اور طنابِ عالم توڑ دینا چاہتا ہے۔ اس کی امید ٹوٹ گئی۔ اس کو یقین آگیا ہے کہ جس کا انتظار وہ کرتا رہا ہے وہ اب پھر نہ آئے گا۔ مایوسی میں انتظار ہی آخری سہارا ہوتا ہے اور جب یہ سہارا ٹوٹ جاتا ہے، تو انسان توازن دماغ کھو بیٹھتا ہے:

اب بجھا دو تاروں کو
چاند کو بھی گُل کر دو
منہ پہ کہہ دو سورج کو

اب یہاں پر یہ نکتہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ۱۹۱۷ء سے اس طرح کی کوششوں میں تیزی کیوں آتی گئی اور راتتے سارے اصحاب رائے اس امر پر متفق کیوں ہو گئے کہ انگریزی خیالات اور انگریزی ڈھب کی شاعری کی ضرورت ہندوستان کو ہے؟ بات یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کا جبر و استیلا برابر بڑھتا ہی گیا اور ہندوستانی قومیت ہر طرح کے شکنجے میں کس دی گئی۔ اب یہاں کا معمولی انسان بھی انگریزوں کے ذہن سے سوچنا، ان کی زبان میں بات کرنا، انگریزی بولنا، اگر انگریزی بولنے پر قادر نہ ہوتا تو چند الفاظ ہی انگریزی کے توڑ مروڑ کے اپنی گفتگو میں دہراتے رہنا۔ انگریزی کنگھی سے بال سنوارنا، انگریزی مانگ نکالنا، انگریزی میز پر کھانا اپنے لئے باعث صد وقار سمجھنے لگا، اور ایسا ہونا فطری امر تھا کہ حاکم اور فاتح کی زبان و ثقافت محکوم و مفتوح کے لئے نوعیت و رسوخ کا نشان بن ہی جاتی ہے، اب ہندوستانی معاشرہ اس موڑ پر آ گیا تھا جہاں اس کا اپنا پن ختم ہو کر دوسری اکائی میں ضم ہو رہا تھا۔ یہ حضرات بیدار مغز تھے، وقت کے تقاضوں سے واقف تھے۔ اس لئے جدھر ہوا کا رخ دیکھا، اسی طرف چل پڑے ع 'چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی'۔ حالانکہ یہی وقت ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا تھا اور وہ ارباب قلم اس کے اہل تھے کہ اپنی پرانی وضع پر قائم رہ کر قدیم روایت و وراثت کی ضمانت لے لیتے۔ مگر انہوں نے جلد ہی سپر ڈال دی، یہ وقت کی پکار تھی ان کا اس میں کیا قصور۔

ہاں تو یہ پس منظر تھا، جس میں کلیم الدین احمد کی شاعری پلی اور پروان چڑھی۔ اس تمہید کے بعد اب میں آپ کو '۲۴ نظمیں' کی طرف لے جاتا ہوں۔ اس مجموعہ میں کل ۲۲۷ مصرعے ہیں، جن میں بعض دو بار بھی آئے ہیں۔ پہلے میں اس

ڈال لے نقاب اپنی
الٹو خیمۂ افلاک
توڑ دو طناب اس کی
تہ کرو بساط اس کی
وہ جو دل میں آتا تھا
اب کبھی نہ آئے گا

اس جوشِ جنوں کے باوجود شاعر زندہ رہنے کی تلقین بھی کر رہا ہے، وہ گریباں پھاڑ کر جنگل نہیں بسانے چلا جاتا کہ یہی یاد اس کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے ہیں۔ اس کو چپ سی لگ گئی ہے۔ یہ ہے محبت کا ایک نرالا ڈھنگ اور غزل کہنے کا ایک نجی انداز۔

فیض نے بھی انتظار پر نظم لکھی ہے۔ مگر ان کے پاس نہ تو اتنے متنوع تجربات ہیں اور نہ اتنا تیکھا پن۔

فیض کی نظم 'تنہائی' اور 'انتظار' کی نامکمل تصویر پیش کرتی ہے، بلکہ ایک ہی تجربہ کو بار بار دہرا دیا گیا ہے، یاس و محرومی کا اثر وہاں بھی ہے لیکن وہ اثر وقتی ہے، دیرپا بھی نہیں، اکہرا ہے، دبیز نہیں۔

(۴۱) ۸۰ مصرعوں کی یہ نظم شاعر کے تیکھے تیور، اور جلے دل کی پکار ہے۔ اس کی طنز میں گہرائی ہے اور گیرائی بھی۔ یہ پوری نظم ہمیں یہ شعر بار بار یاد دلاتی ہے۔

زندگی اپنی جو اس طور سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کلیم صاحب ایک فلسفی شاعر ہیں، جن کا شعر فلسفہ ہے، مگر شعریت کبھی دامن نہیں

چھوڑتی، یہ فلسفہ زندگی کا فلسفہ، قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ انسان کے ارتقاء و زوال کا فلسفہ، اس کے کمال کا فلسفہ اور اس کے اضمحلال کا فلسفہ ہے۔ وہ امید و عمل کے شاعر ہیں۔ ڈھکوسلوں سے برابر محترز، وہ اوہام کا شکار نہیں ہوتے۔ حقیقت پسند ہیں۔ حقیقت ان کا دین، حقیقت ان کی دنیا، وہ حقیقی عالم کے جلووں سے بہرہ مند ہیں۔ ان کے شہپر فکر کی رسائی دیکھ کر جبرئیل کے پر پرواز ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ دستور زباں بندی سے گھراتے نہیں، ان کے زخمہا سے دل رس رہے ہیں، جن کے گرم گرم قطرے حیات کو سوز دروں سے آشنا کر دیتے ہیں۔ اس نظم کو انھوں نے تین حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں چار ٹکرے ہیں جو چار مشہور مذاہب کی طرف ہمیں ملتفت کرتے ہیں، پہلا ٹکرا وہ صبح کا تارہ بن کے آیا، اے ماہ! وہ مہر بن کے آیا، حضرت ابراہیم کی جستجوئے رب کی طرف اشارہ کرتا ہے، جبکہ انھوں نے چاند، تارے، سورج، جب کسی بڑی شئی کو دیکھا پکار اٹھے، ھٰذا ربّی (یہ میرا رب ہے) لیکن جب وہ غروب ہوگیا، تو کہنے لگے لا احبّ الآفلین (میں غروب ہونے والے سے محبت نہیں رکھتا) جن کو نمرود نے آگ میں جھونک دیا تھا۔ مگر طوفان باد و باراں نے آگ ٹھنڈی کردی۔ دوسرے ٹکرے سے ہم حضرت موسیٰؑ کی بابت سوچنے لگتے ہیں، وہ ابر میں برق بن کے آیا، وہ شعلۂ طور بن کے آیا۔ جن کی تعلیم کا اہم جز تھا، انتقام اور تشدّد:

بحر ظلمت میں ہے تلاطم
موجیں کیسی بپھر رہی ہیں

تیسرا ٹکرا ہمیں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کا بنیادی جز تھا، عفو و رحمت، یہاں تک کہ خود ہی سولی پر چڑھا دیئے گئے:

اللہ یہ کیسا جان و دل ہے
تاریک لہو اُبل رہا ہے

یہ چوتھا ٹکڑا آخری دین سماوی کی بابت اشارہ کرتا ہے۔ حضرت محمدؐ کی تعلیم انسان کی مجبوری و بیکسی کو مختاری اور قدرت سے بدلنا چاہتی تھی، جو انتقام اور خودسپردگی کے درمیان کی راہ بتاتی ہے، جنھوں نے غربت کے شکستہ ساغروں کو ساغرِ جمشید کے مقابل کر دیا۔ مگر ان مذاہب کی تعلیم کا کیا اثر پڑا؟ رفتہ رفتہ دنیا پھر اسی نقطہ پر سمٹ کے آگئی۔ جہاں سے اس کا چکر شروع ہوا تھا۔

غربت، بے چارگی، بے بسی کی ॰ لیکن کوئی دوا نہیں ہے

دوسرے حصہ میں شاعر کا لہجہ تیکھا اور تیز ہو جاتا ہے۔ اس کی طنز گہری اور دوررس ہو جاتی ہے۔ وفورِ جذبات میں وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے۔ جن کے کہنے کی ہمّت اقبال کو بھی نہ ہوئی، اقبال نے شکوہ کیا، مگر وہ انداز شوخ و بیباک ہوتے ہوئے بھی، اپنی باتیں منوا لینے والا نہیں، گرچہ اس کے بیانات بھی تجربات ہی پر مبنی ہیں، لیکن اس نظم میں تجربات قائل کر دینے والے انداز میں پیش کیے گئے ہیں، جن کی حلاوت تلخیوں میں لگی لپٹی ہے۔

یہ ٹکڑا خدا کی آشنائی کا شکوہ ہے، اپنی نارسائی کا گلہ ہے۔ مندروں میں تو اسی خدا کی پوجا ہوا کی۔ مسجدوں میں بھی اسی قادرِ مطلق کی عبادت کی گئی۔ ناقوس نے بھی اسی کو پکارا، اذان نے بھی اسی کی غیرت کو للکارا۔ مگر انجام کیا ہوا، ہر جگہ فساد، ہر جگہ خوں ریزی، ہر جگہ مکر و ریا کی کارگری۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے کوئی پیغام نہیں بھیجا، اگر خدا واقعی کوئی پیغام بھیجتا، تو سارے جھگڑے ختم ہو جاتے، سارے تفرقے مٹ جاتے۔ انسان اور انسان کے باہمی رشتے استوار ہوتے اور یہیں شکایت

کا کوئی موقع نہ رہتا، ہماری زبانیں گنگ ہو جاتیں۔

لب اس کے اگر ذرا بھی کھلتے
یہ میری زبان لال ہوتی
ناقوس نہ مندروں میں پھنکتے
اور مسجدوں میں اذاں نہ ہوتی
یوں دیر و حرم میں خوں نہ ہوتے

ابھی تک انسان وہم و گمان کے زرّیں جال میں قید ہے، وہ یقین تک نہیں پہنچ پایا ہے، وہ شکوک و شبہات کا شکار ہو رہا ہے جس سے اس کے سکون اور چین میں رخنے پڑ رہے ہیں۔ یقین کی اہمیت اقبالؒ نے بھی بیان کی ہے مگر اپنی حد بندیوں ہی میں رہ گئے۔ ان سارے تجربات نے شاعر کی زبان کو اور بھی گرم بیان کر دیا اور وہ ایک تلخ بات بتا رہا ہے۔ تلخ اس لئے کہ ہنوز انسان کا آخری سہارا خدا ہے اور آخری نظام عمل مذہب ہے۔

الہام کہاں، پیام کیسا؟
اُس نے نہ کبھی زبان کھولی
اُس نے نہ کبھی نقاب اٹھائی

شاعر ابھی انکار کی منزلوں سے گذر رہا ہے۔ انکار اس لئے نہیں کہ اس کو ایمان نہیں ہے، بلکہ اس لئے کہ جس کے وجود کا اقرار کیا جا رہا ہے، جس خدا کی خدائی کی توثیق ہو رہی ہے، اس کی خدائی میں اس کا نہیں، بلکہ دوسروں کا تصرّف ہے، انسان درد سے کراہ رہا ہے۔ وہ جبر و تشدّد کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے۔ مگر خدا کی غیرت کو حرکت نہیں ہوتی۔ ابھی شاعر 'لا' کی

منزلوں سے گذر رہا ہے، وہ اِلّا کی پناہ میں آنے کے لئے بیتاب ہے۔ مگر اِلّا کا کرشمہ ابھی نظروں سے اوجھل ہے۔

ہونٹ اِس کے اگر ذرا بھی ہلتے
دل کو نہ شکوک پھر ستاتے
یہ وہم و گماں یقین بنتے

تیسرے حصّہ میں اسی پرانی روایت کا اعادہ ہے جس کو انسان کی درایت نے بغاوت کا رنگ دیا ہے، درحقیقت یہ بغاوت نہیں ہے، بلکہ محبت و دوستی کے برقرار رکھنے کا طریقہ ہے۔ وہ ذات حق لیلائے خودی کا محمل ہے۔ وہ آنکھوں میں نور بن کے سمایا ہوا ہے، ہے ہر جگہ، ہر ذرّہ میں وہ ہے، مسجدوں میں وہ ہے، مندروں میں وہ ہے، وہ ہر دیس میں ہے، ہر مقام پر ہے مگر کوئی ڈھونڈھ تو لے:

ظاہر میں کہیں رہتے ہیں، باطن میں کہیں ہیں
یہ وصف انھیں میں ہے کہ ہے اور نہیں ہیں

اس حصّہ میں میرؔ کے چند مصرعوں سے ایک نیا کام لیا گیا ہے:

افسانے بہت سُنے ہیں اس کے:
وہ مست نیاز ہے حرم میں
وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں
شمشاد ہے سرفراز اس سے
گُل دیدۂ نیم باز اس سے
اس کا ہے عکس جام مے میں
آتی ہے صدا اسی کی نے میں

بشنو از نے چوں حکایت می کند ؛ وز جدائیہا شکایت می کند

یہ شعر کی خوش خیالیاں ہیں
یہ آب نہیں، سراب دل ہے

شاعر اپنی دنیا سے اپنے گرد سے غیر مطمئن ہے، وہ پوچھتا ہے :

مندر میں کسی نے اس کو دیکھا
مسجد میں کسی نے اس کو پایا

یہ ہے اضطراب دل کے اظہار کی ایک شکل، شاعر خدا کی بے رخی پر تعجب کرتا ہے۔ اس کے کبر و غرور کو جھنجھوڑتا ہے۔ اس کے وجود کو بیدار کرتا ہے۔ وہ مندروں اور مسجدوں کی دُہائی دیتا ہے۔ مگر وہ اس تیرہ خاکداں سے کوچ کر چکا ہے، دن رات ناقوس بجتے ہیں، اذانیں ہوتی ہیں۔ ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے طور پر اس کی یاد کرتا ہے مگر :

اللہ رے کبر و ناز اس کا
سُنتا نہیں وہ ذرا کسی کی

اب بغیر خدا کے دنیا شر کا مسکن ہو کے رہ گئی ہے اور خیر کا مدفن یہی تو ہے، جو کلیم صاحب کو ایک بڑے سے بڑے انسانیت کے شاعر کا درجہ دلواتا ہے وہ اشارے پر اشارے کرتے جاتے ہیں اور ماحول میں یہ آیت بکھری ہوئی دیکھ رہے ہیں اِنِّیْ وَجَّھْتُ الخ۔ یہ ہے بنیاد توحید، یہ ہے بنیاد بندگی، یہ ہے تمیز بندہ و آقا، شاعر کا دل اپنی ساری کثافتوں کو صیقل کر کے سراپا لطافت بن گیا ہے، آخر کے دو مصرع : وہ کون ہے خاک دخوں میں غلطاں
یہ کس کی فغاں ہے چرخ بر دوش

ہمارے سامنے ایک جہانِ معنی لے آتے ہیں اور پھر دوسرا مصرعہ سارے کے سارے اسی محور پر چکر کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انسان خاک و خوں میں لوٹ رہا ہے اس کی آہ نیم شبی آسمان میں رخنے ڈالنے کو تیار ہے۔ مگر :

اللہ رے کبر و ناز اس کا
سنتا نہیں وہ ذرا کسی کی

یہ راز اب آشکار ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کو کیوں ڈھونڈتا ہے، وہ اسے کیوں دیکھنا چاہتا ہے، وہ ہستی جو ہر شئے میں ہے۔ ہر جگہ ہے۔ شاید اس بیکسی کے مسکن سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو چکی ہے، ورنہ اتنے سارے بیکسوں کے آنسو شعلۂ طور بن کر ضرور چمکتے۔ اس نظم کے بعض ٹکڑے بڑے ہی جاندار ہیں، اگرچہ یہ متفرق سماں سامنے لاتے ہیں۔ مگر سب ایک اکائی کی حیثیت لے کر پوری نظم کو اس طرح سجا دیتے ہیں کہ ایک لفظ بیکار نہیں معلوم ہوتا، ایک خیال آوارہ نہیں رہتا اور ایک انداز بیگانہ نہیں دکھائی دیتا۔

(۴۲) اس مجموعہ کی یہ آخری نظم ہے اور سب سے طویل ہے ۔ ۳۵۴ مصرعوں کی یہ نظم ۵ ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب میں چند حصے ہیں۔ یہ نظم ساری نظموں کی جان ہے، پوری کتاب کو اگر ایک نظم سمجھئے تو یہ کلائمس (عروج) ہے، چونکہ یہ نظم عروج ہے اسی لئے اس میں کشش اپنی آخری منزل پر ہے، یہاں رمزیت اور شاعری میں کامل اتصال ہے۔ یہ نظم حال ہی میں لکھی گئی ہے، جبکہ سب سے پہلا انسان خلا میں پرواز کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً اسی خیال نے کلیم صاحب کے جذبات کو مہمیز کیا ہے۔ وہ آسودگی کے خواہاں ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی ساری انسانیت کسی نہ کسی طرح سے سوگوار نظر آ رہی ہے، انسان تمیزِ خالق و مخلوق بھول گیا

انسان اپنے رتبہ اور اپنے محل کو فراموش کر بیٹھا۔ وہ طرح طرح کے جال میں پھنس گیا ہے اور پھنستا جا رہا ہے، وہ جسم کا قیدی بن کر رہ گیا ہے، اس کی روح خوابیدہ بلکہ مردہ ہے، کبھی وہ سائنس کی کامیابیوں پر ناز کرتا ہے۔ کبھی فطرت کی زرنگاریوں پر مچلتا ہے۔ مگر فطرت بھی اس کی مدد نہیں کرتی۔ سائنس بھی اس کو پناہ دینے سے قاصر ہے۔ مجبور ہو کر انسان کو پھر نقطۂ اول کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اسے جسم کے تقاضوں سے بھی اونچا اٹھ کر کچھ اور تقاضوں کو پورا کرنا ہے جب تک وہ روح سے مدد نہ لے گا۔ اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی کہ ہر شئے فانی ہے۔ دنیا کی ساری رنگینیاں فانی۔ یہ جوان امنگیں، یہ شوخ و شنگ پریاں، یہ سائنسی کمالات سب کے سب مٹ جانے والے نقوش ہیں، اگر باقی ہے، تو وہی روح، وہی خدا کی شان، وہی خدا کی آواز، میرے خیال میں اس نظم میں ڈوائن کامیڈی کی جھلک ہے اور جاوید نامہ کا رنگ اور فتوحات مکیہ کا پرتو۔

پہلے حصہ میں مختلف مناظر ہیں اور مختلف تجربات ہیں۔ فطرت کی بوقلمونیاں ہر آن دعوت نظارہ دیتی ہیں، یہ حصہ صبح کے تجربات کو بیان کرتا ہے، تجربات بھی متنوع ہیں اور مناظر جلد جلد بدلتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ شاعر کا سکون نا آشنا دل سکون کا متلاشی ہے اور جلد جلد ادھر سے اُدھر بھاگتا ہے کہ کس جگہ سکون مل جائے۔ یہ اضطراب براہمی اضطراب کی طرح ہے، حضرت ابراہیم بھی اپنے رب کی دریافت کے لئے پریشان تھے، انھوں نے آفتاب دیکھا، ماہتاب دیکھا، مگر ان غروب ہو جانے والی مخلوقوں کو وہ اپنا معبود نہ بنا سکے اور آخر میں پکار اٹھے: اِنّی وَجَّھتُ وَجھِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضَ حَنِیفًا وَّ اَنَا مِنَ المُشرِکِین۔

یہاں بھی شاعر بے قرار ہے مگر اقبال کی طرح یہ نہیں کہہ اُٹھتا

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

بلکہ وہ ان سارے تجربات کو پیش کرتا ہے جو ایک بے کل دل کو پیش آتے ہیں، وہ کس طرح حیران، پریشان، پناہ اور راہ فرار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، زمین کی ہر بوالعجبی کو دیکھ کر اس پر بھروسہ کر لیتا ہے اور اس کی پناہ میں جانا چاہتا ہے، جو زمین سے مایوس ہو کر، فضاؤں، خلاؤں اور آسمانوں کو اپنا ہمدرد بنا کر، ان کی پناہ میں جانا چاہتا ہے، مگر وہاں بھی مایوسی ہوتی ہے، آخر امروہ اپنے من کی دنیا میں جھانکتا ہے اور روح کی اہمیت کو سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

صبح کا سہانا وقت ہے، فطرت اپنے سہاگ کو نکھار رہی ہے۔ اپنے حسن کو نکھار رہی ہے، سارا گلشن لالہ و گل و ریحاں سے بھرا ہوا ہے۔ بہ ظاہر ان سے خوشبو کی جو لپٹ آتی ہے، وہ تسکین قلب کی ہولے کر آتی ہے۔ مگر شاعر کا دل راہ نجات کی تلاش میں ہے۔ اسے ان ظاہری زیبائش میں فوز و فلاح نظر نہیں آتے، وہ تو آزادانہ سوچنے کے لائق بھی نہ رہا، اس کی آنکھیں زندانی، عقل محبوس، جان و دل قیدی اس قید و بند سے نجات کیونکر ملے، جو کوئی راہ نجات اور تلاش کی جائے، وہ تہذیب فرنگ کے قید و بند سے انسان کو آزاد کرانا چاہتا ہے، مگر اس کی عقل حق شناس، اس کا جسم اور اس کی روح سب کے سب زندانی ہیں۔ بس ایک ہی ڈھب سے سوچ سکتے ہیں، ایک ہی منظر کو دیکھ سکتے ہیں، شاعر ان معصوم انسانوں کے اخلاق سوز حرکات دیکھ کر کڑھتا ہے

تلملا جاتا ہے، وہ خون کے آنسو روتا ہے، روتا ہے اور شعر کہہ کہہ کر اپنے وقت کاٹ رہا ہے، وہ اس انتظار میں ہے کہ افرنگ کا جادو ٹوٹے گا اور انسان راہ نجات پائے گا۔

اب دوسرا منظر سامنے آتا ہے، اپنے جرم اور عصیاں کا احساس آتے ہی دن میں بھی تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے، یہ سیاہ دیواریں گناہوں کی، اللہ کی پناہ: بڑی خوفناک ہوتی جا رہی ہیں۔ ان دیواروں کے شگاف اپنی کالی کالی آنکھوں سے برابر عصیاں کار آدم کو گھورے جا رہی ہیں۔ کبھی کبھی کوئی روشنی احساس گناہ کی چھن کر آتی بھی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ناسور سے پیپ بہہ رہی ہے، وحشت بڑھ جاتی ہے، سراسیمگی اور مجبوری کا احساس سوہان روح بن جاتا ہے، اب وہ سوچتا ہے کہ اس قید خانہ کے روزن سے جھانک کر دیکھا جائے بیرونی دنیا کا کیا حال ہے، باہر تو ایسا معلوم ہوا کہ ساری فطرت پر حیات اور حیات کی رنگینیاں چھائی ہوئی ہیں۔ گل شاداب ہیں، سبزے نکھار پر ہیں، گل کی نرم پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے۔ یہ نشاط انگیز فریب آمیز، پُرکار و سحر کار مناظر فطرت اسے اپنی آغوش میں پناہ لینے کے لئے بلاتے ہیں۔ اس کی جنون آور، اور معصیت پرور فضا اسے بہکنے کی دعوت دیتے ہیں:

آؤ میری محفل میں
دیکھو مجھ سے مٹ روٹھو!

اب یہ تیسرا منظر سامنے آتا ہے، آسمان نشان ایوان اور زرنگار محلوں کو دیکھو، شاید یہاں پناہ ملے، شاید یہاں فرار کی راہ ملے، جہاں قاقم و سنجاب حریر و دیبا کے بستر بچھے ہوئے ہیں اور کسی کے نرم ہونٹ اس کو بلاتے ہیں، اپنی

مجموعہ کی ہر نظم کا سرسری جائزہ لیتا ہوں۔ اس کے بعد اس کتاب پر مجموعی حیثیت سے اپنے تاثرات پیش کروں گا۔

(۱) اس مجموعہ کی پہلی نظم چودہ مصرعوں پر مشتمل، غزل سے بیزاری کے بعد پہلی نظم ہے، جو حافظ کے دو اشعار کی بالیدہ اور منظم شکل ہے، جس کے تیور کی ہمہ جہتی کو کلیم صاحب نے یکجہتی میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس نظم کی پہلی سطر ہے:

"چمن تھے، ہمنوا تھے، گل بدامن، دامن دل تھا"

اس میں ہم ان کے من کی دنیا کا جو کبھی ان کے ارمانوں کی دنیا تھی، تماشا دیکھتے ہیں۔ یہ ان کی آپ بیتی ہے، اس میں ان کی اندرونی کیفیات، ان کی محبت، ان کی آسودگی اور پھر ان کا انتشار ذہنی سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایک غیر مقفی قطعہ ہے۔ جسے ہم سانیٹ کہتے ہیں۔ ایک مصرع دوسرے سے اس طرح لگا لپٹا ہوا ہے، کہ جب تک پوری نظم نہ پڑھ لی جائے، کوئی بات صاف طور پر ذہن میں نہیں آتی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم شاعر نے اپنے چمنِ ہند سے دور، شاید لندن میں لکھی ہے، ان کا چمن چھوٹنے کا غم تو ہے۔ لیکن ہم نوایان چمن کے چھوٹ جانے کا اندوہ اندر ہی اندر گھلا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لندن میں کسی ایسے ماحول میں رہتے تھے، جہاں انہیں کوئی ہم نوایانِ چمن کا نعم البدل بن نہ سکا۔ وہاں تو ان کو ایسی ویرانی نظر آئی کہ ع "بیاباں کے بگولے رو رہے ہیں موج ساحل کو"۔ اس کے آخری دو مصرعے سے کلیم صاحب کی زندگی کا وہ اب ماضی بعید ہو گئی ہے، ایک مستانہ اور محرومانہ ادا سامنے آجاتی ہے۔

کبھی آنسو بہاتا ہوں، کبھی فریاد کرتا ہوں
شبِ تاریک ہے، میں ہوں کسی کو یاد کرتا ہوں

شبِ تاریک میں کلیم کس کو یاد کرتے تھے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک

ریشمی آغوش میں سما جانے کی ترغیب دیتے ہیں:

چھوڑو بستر خاکی
چھوڑو خشت کا تکیہ
میری ریشمی آغوش
انتظار کرتی ہے

یہ منظر جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، مبادا بستر خاکی، بستر یاسمیں سے بدل نہ جائے اور خشت کا تکیہ ریشمی آغوش میں بھول نہ جائے، ورنہ وہ تن آسانی کا شکار ہو کر اپنے فرض سے غافل ہو جائے گا۔ یہ جستجو اور تڑپ ختم ہو جائے گی، تو پھر زندگی کی تازندگی ختم ہو جائے گی۔ اس ایوان کیواں شکوہ سے باہر اونچے اونچے پہاڑ ہیں، جن پر برف کی دستار نے نور سرمدی بکھیر دی ہے، آبشاروں سے پانی گر رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی یہ بیتاب لہریں پارووں کے سانپ بنی ہوئی ہیں۔ ان لہروں سے صدا بہار نغمے نکل رہے ہیں، یہ سریلے نغمے دلوں میں ولولے پیدا کر رہے ہیں اور یہ بیتاب لہریں زنجیر بن بن کر اس کے جسم و جان کو اسیر کر رہی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت بھی اپنی برہمی کا اظہار کرنے لگتی ہے، پھول شعلے بن جاتے ہیں اور سارے چمن میں آگ سی لگی ہوئی دکھائی دیتی ہے، فرار کا ڈھونڈھنے والا انسان آگے بڑھتا ہے بڑھتا جاتا ہے اور اپنی امیدوں کو بار دگر جگمگاتا ہوا پاتا ہے:

پھر یہ رنگ کے طائر
بال و پر ہلاتے ہیں
دور دور اڑتے ہیں

پیارے گیت گاتے ہیں

مگر اس کو زندانی کا احساس کبھی نہیں چھوڑتا، وہ بے قرار بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کی خودی مجروح ہو گی۔ وہ ٹھہر بھی نہیں سکتا کہ اس کو زندگی سے کارہائے عظیم لینا ہے اور زندگی نام ہے حرکت کا، مسلسل حرکت کا۔ قیدی کے لئے قید و بند کا احساس اس کے غم اور اس کی مجبوری کو اور بھی شدید کر دیتا ہے:

میں ہوں اور زنداں ہے
خاک کا یہ بستر ہے
دل تڑپ نہیں سکتا
جاں نکل نہیں سکتی

اور بقول اقبالؒ:

منظر چمنستاں کا زیبا ہو کہ نازیبا
محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے

یہ تو زنداں کی بات تھی، اب آفتاب عالمتاب بلند ہوا ہے۔ ذرا صحن چمن میں جا کر تو دیکھا جائے۔ آسمان صاف نظر آ رہا ہے اور ابر کا ایک ٹکڑا شاید امن کا پیغامبر بن کر اِدھر اُدھر سراسیمگی کی حالت میں دوڑ رہا ہے۔ اس عالمِ یاس میں مجبور و حیران شاعر کو کچھ یقین سا ہو چلا ہے کہ تہذیب کی یہ عریانیاں، انسانیت کی بدنمائیاں یہ آزاد و بیباک تصویریں، جسم و روح کو بھی فروخت کر دینے والی مریمیں ایک دن ضرور ہی صراطِ مستقیم پہ آ جائیں گی، بجلیاں چمک رہی ہیں، ہوا کے تیز و تند جھونکے انسانیت کی شاخوں سے اُلجھ رہے ہیں۔ یہ کالے کالے بادل منظر کو بھیانک بنا رہے ہیں۔ یہ فطرت کا انتظام ہے۔ زنداں کے دروازے اب ٹوٹ کے رہیں گے۔ یہ سیاہ

دیواریں گونجیں گی۔ یہ زمین بدلنے کو ہے۔ یہ آسمان بدلے گا۔ بارش کا زور بڑھتا گیا، ساری زمین جل تھل ہو گئی، اب طوفان نوح کا انتظار ہے، اب یہ سیارہ دنیا فنا ہو جائے گی اور ایک پُر نور دنیا وجود میں آئے گی۔ انسانیت کا پیغامبر شاعر اپنے تخیلات کے شاہین کو کہاں کہاں پرواز سکھا رہا ہے — مگر وائے ناکامی اس کے تخیلات نے بھی جواب دیدیا۔ طوفان تھم گیا، بارش رک گئی، بادل فرار ہو گئے اور پھر مایوسی کا وہی رنگ غور کر آیا، اسے پناہ نہ ملی، نجات کی راہ اس کی آنکھوں سے پھر اوجھل ہو گئی اور شاہین کا یہ غرور اسے نیچا دکھا دیتا ہے:

آج گنبدِ مینا
کی بلند چوٹی پر
آشیاں بناتا ہوں
اور طائرِ سیارہ
کو بھی صید کرتا ہوں
بس چلا تو یزداں کو
آج صید کرتا ہوں

یہ گرم گرم تصورات اور جاندار تخیلات کا شاہین پرواز تو کرتا رہا، معصوم ننھے منے پرندوں پر ایک ہیبت سی طاری ہو گئی اور وہ پرندے سب ڈر سے پھڑ پھڑانے لگے ہیں۔ معلوم نہیں اس شاہین کا مقصود کیا ہے۔ کیا وہ آسمان کی دنیا بدل دے گا، کیا وہ فرشتوں کو پامال کرے گا۔ مگر شاہین کے پَر بھی جل گئے، وہ غائب ہو گیا اور ان مناظر نے بھی راہ نجات نہ دکھلائی۔

کلیم صاحب مشرق کی زمین دیکھتے ہیں۔ مشرق کا آسمان دیکھتے ہیں۔ مشرق کی غلامی انسانیت کی کڑی آزمائش بلکہ خدا کی خدائی کی بے باک کسوٹی ان کے سازِ دل کو بار بار چھیڑتی رہتی ہے۔ اگر زمین انھیں سکون نہیں دیتی ہے، تو وہ آسمان کا رخ کرتے ہیں کہ دوری منزل بھی ضربِ غلامی کے احساس کو گوارا بنا دیتی ہے۔ ان کا شاہین ان کے وجود کا آدم، ان کے اندر کا آدم بیدار ہوتا ہے، وہ خدا کی بستی میں جانا چاہتا ہے کہ وہاں عرش و کرسی کے پائے ہلائے۔ غیرتِ حق کو جھنجھوڑے اپنی حق پرستی کی دہائی دے، اس کے وعدے یاد دلائے اور اپنے زخم کا مرہم مانگے اسی طرح وہ یزداں کو شکار کرنا چاہتا ہے کہ وہ تو اپنے وعدوں کے جال میں بس ہے، خدا ضرور اس کی مرضی کے مطابق کرنے پر مجبور ہوگا، ممکن ہے کہ شاہیں سے مراد خودی ہو یا اندر کا آدم، وہ تو سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ جہاں فرشتے پر نہیں مار سکتے۔ مگر آدم گیا اور اب بھی جا سکتا ہے۔ اگر اس کا خیال معصوم ہے، اس کا تجسس پاک ہے اور خیالات صاف ہیں۔

ملٹن (Milton) نے بھی انگریزی قوم کو عقاب سے تشبیہہ دیا ہے جس سے چھوٹی چھوٹی چڑیاں دہشت زدہ ہو جاتی ہیں

صبح آئی، دن ہوا، دن ختم ہوا، شام آئی اور اب رات ہوگئی۔ سکون کا بھکاری انسان مناظرِ قدرت کے آگے کشکولِ گدائی لے کر ادھر ادھر بھٹک رہا تھا مگر اس کو کوئی سہارا نہ ملا، اب رات کی آغوش میں وہ پناہ لینا چاہتا ہے، یہاں باغ میں پھول کھلے ہیں۔ رنگوں کی بہار آئی ہوئی ہے، نور کے چشمے ابل رہے ہیں، چاند اپنی کرنوں کو زمین پر بڑی فیاضی سے بکھیر رہا ہے، ستارے جگمگا رہے ہیں۔ اب ہر طرف

روشنی نظر آنے لگتی ہے، مایوس انسان کو امید بندھتی ہے کہ انھیں چاند تاروں کی چھاؤں میں اسے راہ نجات مل سکیگی۔ امید فردا کی اس روشنی نے مجبور انسان کے دل میں کتنے چراغ روشن کر دیئے، تیرگی کانپنے لگی، چاندنی پھیلنے لگی اور قیدخانہ بھی روشن ہونے لگا۔ سارا ماحول بقعہ نور بن گیا، شاید غیرت حق کو حرکت ہوئی اور فرحت وانبساط سے زندان و زندانی سب کے سب مخمور نظر آنے لگے۔ مگر جلد ہی نور کا یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے، شاعر کا رخش خیال اپنی چال بدلتا ہے۔ وہ چاند تاروں کی ضیا باریوں کو دیکھ کر اپنے محبوب کے حسن وقار کو یاد کرنے لگتا ہے اور کہنے لگتا ہے، چاند تو ازلی افلاس زدہ ہے۔ اس کی روشنی ادھار پہنچی کی ہے، وہ رعب کیا جا سکے گا۔ ہمارے محبوب کی بارگاہ میں کتنے تارے رقص کرتے ہیں اور اس کی تابانی سے چاند کا چہرا بھی ماند ہو جاتا ہے کہ ایک کی روشنی فطری ہے اور ایک کی عارضی:

کیسے کیسے سیّارے
ان کی بزم انور میں
رقص ناز کرتے ہیں
کیا سمجھو کے بیٹھے ہیں
کیا قیامت اٹھتی ہے!
ہر ادا میں جنّت ہے
ہر نگاہ جنّت ہے

پھر یہ سارے تصورات کچھ اس طرح الجھاؤ پیدا کر دیتے ہیں کہ وہی قدیم ازلی ناآسودگی انسان کی سامنے آجاتی ہے۔

یہی ناآسودہ انسان، دنیا کے عدم توازن اور عدم مساوات کو دیکھ کر راہ نجات کی تلاش میں ہے۔ فطرت کی پہنائی نے اس کی کوئی مدد نہ کی، وہ جس طرح ایک زندان میں خود کو محسوس کرتا تھا، وہ احساس بدستور باقی ہے، اب وہ سائنس کی دنیا سے مدد کی درخواست کرتا ہے، اب وہ پناہ کے لئے سائنس کی آغوش میں آنا چاہتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ ایک سائنسداں زندگی کی حقیقت اور خدا کی قدرت کو جن تجربوں کے ذریعہ جانتا پہچانتا ہے، ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا کی خدائی کا قائل ہو کے رہے، وہ دیکھتا ہے کہ ایک آم میں یا سیب میں کتنے اجزا ہیں اور کس حصہ میں ہیں، وہ سارے اجزاء انھی مقدار میں فراہم کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ آم یا سیب کا ایک دانہ بھی بنا نہیں سکتا۔ میرے خیال میں یہ بہتان ہے کہ سائنس جاننے والا الحاد کی منزل پر دم لیتا ہے، ہاں اس کے عرفان حق کا ذریعہ طریقہ استنزاد ہے ——

(Elminahon) ہے۔ وہ 'لا' سے شروع کر کے 'الا' تک پہنچ جاتا ہے۔ اس مجبور انسان کو سائنس بھی اپنی پناہ میں نہ لے سکی، گرچہ سائنس نے بہت ترقی کی اور آسمان کی خبر لانے لگی، راکٹ پر راکٹ آسمان پر بھیجے جا رہے ہیں۔ زمین کو آسمان کی باتیں معلوم ہوئی جاتی ہیں۔ ایک طرف امریکہ اپنی دولت بہا رہا ہے۔ دوسری طرف روس اپنے وسائل سے کام لے رہا ہے، کوئی ان نادانوں سے پوچھے:

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

تیر بن کر یہ راکٹ محفلِ فلک کو نشانہ بنائے ہوئے در آئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے ٹوٹ ٹوٹ کر تارے آسمان پر آ رہے ہیں۔ ابھی تک تو ایسا ہی ہوا تھا کہ آسمان سے تارے ٹوٹ کر زمین پر گرتے رہے، خواہ کسی وجہ سے۔ یہ

اقتضائے کشش ثقل ہو یا رجم شیطان ہو۔ مگر اب تو زمانہ الٹا جا رہا ہے۔ زمین کے تارے آسمان پر جا رہے ہیں جن سے خطرہ ہے کہ نظام شمسی میں خلل آ جائے، یہ چاند، تارے، کہکشاں، سب درہم برہم ہو جائیں۔ چاند، تارے حیران ہیں۔ کہکشاں بھی حیران ہیں، ننھے ننھے یہ تارے، آج پریشان کیوں ہیں:

دیکھو ان ستاروں میں
کوئی شوخ بیٹھا ہے
تاک جھانک کرتا ہے
اور ناز سے اُٹھ کر
وہ خلا کی موجوں پر
پھر خرام کرتا ہے

آسمان والے گھبرا جاتے ہیں، عرش کے مکیں کی جبیں پر شکن در شکن آنے لگتی ہے، شاید کوئی خاکی محرم اسرار حق و باطل ہوا چاہتا ہے، یہ کون ہے جو اس طرح بے باک چلا آ رہا ہے، یہ جرأتِ رفتار اور یہ قوتِ کردار انسان میں تو ہو نہیں سکتی، ضرور یہ شیطان ہوگا، وہی ابلیس ہوگا، جس کو ہم نے ایک متعین مدت کے لئے مہلت دے رکھی ہے (اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ) اور اگر کوئی انسان ہے، تو وہ بالیقین ہلاکو ہوگا، یا غزنوی:

آج اکیلا آیا ہے
اور کل یہی کافر
فوج ساتھ لائے گا
سلطنت کو لوٹے گا

یہی عہدہ آج معبود بننے کا خواہاں ہے، اس کی فدویت، حاکمیت سے کیوں بدل رہی ہے، نہیں، یہ ضرور شیطان ہوگا، ہو نہ ہو وہ شیطان ہے، جو خروج کرتا ہے، آسمان کو روندے گا، عرش کو بھی روندے گا، آج عرش والوں کو وہ مزہ چکھائے گا، اس لئے کہ شیطان برابر دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح

اس حصہ میں ایک بات تو یہ کھٹکتی ہے کہ خدا کی عالم الغیبی پہ طنز ہے، دوسرے یہ ٹکرا، یا ہے غزنوی کوئی، عرش والوں کو یہ شرمسار کرنے کے لئے لایا گیا ہے، اگر یہ لفظ غزنوی کا نہ ہوتا، تو مناسب تھا،

جب اس شیطان کو اور قریب سے دیکھا گیا، تو پاسبانِ فلک چلا اٹھے:

یہ تو جنت سے نکالا ہوا انساں نکلا
یہ تو میرا آدم ہے
جس کو کس رعونت سے
عرش کے فرشتوں نے
زرنگار جنت سے
ایک دن نکالا تھا

اسی کے ساتھ جواب شکوہ کا یہ بند پڑھ لیجئے:

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی — بولے سیارے، سرِ عرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہل زمیں ہے کوئی — کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

خود یزداں محوِ حیرت ہو جاتا ہے، آدم کی جرأت پر اس کو رحم آجاتا ہے، وہ بیتی ہوئی یادوں کو جمع کرنے لگتا ہے:

حرف یہ زباں پر ہے
کتنی طول ہیں اللہ
انتظار کی گھڑیاں
آؤ اپنی جنت میں
میرے بھولنے والے
عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

اب یزداں اور انسان میں میل ہو جاتا ہے، گلہ و شکوہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

میں ہوں اور تنہائی
درد دل کہوں کس سے
کون ہے جو سُن پائے

یزداں اکیلا ہے، تنہا ہے، آسمان اپنی ساری تابناکیوں کے باوجود اس کے دل کو منور نہیں کر سکتا، جنت کی حوریں، دوزخ کی آگ، سب بیکار ہیں، سب بیکار، یزداں کی زبان پر یہ شکوۂ تنہائی ہے۔ خود کا دل درد سے معمور ہے، وہ ملول ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر کو کس طرح بگڑتے دیکھ رہا ہے، مگر مجبور ہے، مجبور ہے کہ اس نے ہی تو اسے زندان خانہ میں بھیج دیا اور خود ہی ایک مدت مقرر کر دی، وہ اصول کا پابند ہے، مگر اپنے بنائے ہوئے اصولوں سے گھبرا گیا ہے، وہ آدم کو دیکھتا ہے، تو ایک طرح کا سکون محسوس کرتا ہے، وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دنیا کی ساری

رونق، بلکہ بزم افلاک کی ساری زینت آدم ہی سے تھی۔ یہ طلسم نور افشاں، یہ بنتی دنیا، یہ چمکتی کائنات دعوت نظارہ دے رہی ہیں اس لئے آدم، اے مرے ڈھونڈنے والو! یہ حصار کائنات مسمار کردو اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کے اسم اعظم سے سومنات عالم کو تہس نہس کردو، آؤ، میرے پاس آؤ کہ میں نے اپنا سب کچھ تمہیں سونپ دیا تھا، اپنی طاقت، اپنا علم، اپنی عقل، اپنا عشق، اپنا دل، اب آؤ، لوٹو میرے پاس لوٹو کہ میری آنکھیں روشن ہوں، میری عقل روشن ہو، میرا دل دل بنے، پھر زمین آسمان ہو جائے، خاک نور بن جائے، آدم یزداں ہو، یزداں آدم ہو، پھر وہ سب کچھ ہو، جو تم چاہتے ہو۔

یکبارگی سارا طلسم خیال ٹوٹ گیا، ان شیریں و فریب کام تصورات نے کوئی مدد نہ کی، نجات کی راہ پھر نہ ملی اور وہی احساس زندانی بار دگر خود کر آیا ہے، آنکھ میری زنداں ہے، عقل میری زنداں ہے، شعر میرا زنداں ہے، کیسے قید سے چھوٹوں، کیسے بیٹھیں دیواریں، کیسے ٹوٹیں زنجیریں۔ اس ٹکڑے پر اقبال کے ساقی نامہ کا ایسا رنگ ہے، جو ایک انسانیت نواز شاعر کے یہاں اچھی طرح نکھر پایا ہے۔

یہاں ایک مقام بہ ظاہر کھٹکتا ہے:

کتنی طول ہیں اللہ
انتظار کی گھڑیاں

(طول کہنے سے جو بلاغت آگئی ہے، وہ طویل سے پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور مصدر، صفت کے معنی میں مستعمل ہوتا رہا ہے)

آخری حصہ میں اس کا بیان ہے کہ سائنس نے بھی گم گردہ سکون انسان کو سہارا نہ دیا، فطرت نے نقش و نگار بنائے، خیاباں خیاباں بو خرام کرتی رہی، بجلیاں گل

خود کلامی ہے اور ان کو آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر ع غربت میں تیری یاد نے رسوا کیا مجھے، زبان پر آجاتا ہے۔ پورا قطعہ پڑھنے پر تسکین نہیں ہوتی۔ شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ان کا دل سکون نا آشنا رہا تھا، پڑھنے والے بھی تسکین نہ پا سکیں۔ مجموعی طور پر غم بیان ہوا تند اور تیکھا نہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں اس کا یقین ہے کہ غم کے یہ دن، اور جدائی کی گھڑیاں جلد ہی بیت جائیں گی۔ اس لئے یہ عارضی غم ایک رنگین غم بن گیا ہے۔

کلیم صاحب الفاظ کے شاعر نہیں۔ اس لئے وہ الفاظ کی پرواہ کم کرتے ہیں۔ اس کے دوسرے اور نویں مصرع میں کچھ نظر کی گنجائش ہے۔ مگر انہوں نے اس نظم پر نظر ثانی اس واسطے نہ کی کہ ان کی غیر مقفی شاعری کا تدریجی ارتقا نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ خزاں کا ہنستا ہوا آنا ایک فکر انگیز استعارہ ہے 'خوشی کے پھول کھلتے تھے مری چشم تمنا میں' بادی النظر میں یہ تشبیہ ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ مگر غور کرنے سے اس کی رمزیت آشکار ہو جاتی ہے۔

آخر میں بس یہی کہوں گا کہ اس سانیٹ نے کلیم صاحب کے دل کا معاملہ کھول کے رکھ دیا۔ مگر یہ معاملہ سماج کی جبین پر بدنما داغ نہیں۔ یہ توانا اور صحت مند ہے۔ ان کی محبت قابل قدر معاملہ ہے اور اخلاق عالیہ کی معلم۔

خدایا گردش تقدیر یہ لائی کہاں مجھ کو
بیاباں کے بگولے روندتے ہیں موج ساحل کو
نظر آتا نہیں اس دشت میں یک ہمزباں مجھ کو
کسی صورت قرار آتا نہیں اس مضطرب دل کو

(۳) چھوٹے بڑے سولہ [16] مصرعوں کا ایک نئے انداز کا یہ قطعہ، ہئیت میں مختلف

کرتی رہیں، مگر راہ نجات نہ ملی، سائنس نے ترقی کی، زمین کو آسمان سے ملا دیا، غریبوں کو غیرت دلائی، ان کی قدرت کو مہمیز کیا، اپنی پچھلی سطوت اور نیابت کا واسطہ دیا۔ سب صدا بصحرا ثابت ہوئیں، اب ہر طرح ہستی کا فریب عریاں و بے نقاب ہو گیا۔ مگر غریب انسان جس کی عقل پر مفلسی برستی ہے، جس کا جسم مضمحل ہے، جس کی روح ناتواں ہے، وہ اپنے حسین گھروندوں سے خوش ہے اور تمام عمر اسی جد و جہد میں صرف کر دیتا ہے، وہ مادہ میں روح کو تبدیل کرنا چاہتا ہے، اسے اپنی عقل پر، اپنے علم پر بھروسہ ہے، فریب کا شکار ہوتا ہے، مگر وہ فریب ہی میں رہنا چاہتا ہے، یہی المیہ آدم کے ساتھ از ابتدا تا انتہا رہا ہے اور کوئی عرش پر بیٹھا، مشق ناز کرتا ہے۔

جب ہر طرح کا سہارا تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا اور عالم امکاں میں درد کا مداوا نہ ہو سکا، تو شاعر انسان کو اس کے اپنے دل کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ:

جلوہ گر ہے تجھی میں اے ذرّے
جس کی خاطر تجھے تگاپو ہے

اب اس پر یہ راز منکشف ہوتا ہے:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

دل کی طرف جھانکنے سے یہ بھید کھل گیا کہ راز کُنْ فَیَکُوْن یہی دل ہے، یہاں پر روح ہی انسان کو نجات دلا سکتی ہے، وہی اسے پناہ دے سکتی ہے، کون روح! وہی روح جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (لوگ تم سے روح کی حقیقت پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے کہ روح خدا کی ایک شان ہے، اس کا ایک رنگ ہے، اس کا ایک حکم ہے)

اسی امر کے ایٹمی ذروں کو مجتمع کرو اور روشن کرو تو یقین ہے کہ یہ دنیا، یہ کلجگ بدل جائے، انسان کی بے کلی دور ہو، اس کو سکون ملے، اس کو راہ نجات ملے، اس کو وہ سب کچھ ملے، جس کا وہ وارث ہے اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصَّالِحُوْنَ (بے شک زمین کے میرے نیک بندے ہی وارث ہوں گے) اس وارث کے آگے فرق دوئی مٹ جائے گا، اور ساری کائنات پر، ماورائے کائنات پر انسان کا دل متصرف ہوگا کہ انسان کا دل خود خدا کا دل ہے، اس دل میں وہی جھانکتا ہے، وہی جھانک سکتا ہے:

پھر نہ یہ زمیں ہوگی
پھر نہ یہ فلک ہوگا
رنگ و نور کے گلشن
مثلِ بُو ہَوا ہوں گے
سینۂ ازل ہوگا
اور میرا سر ہوگا
ایک میرا دل ہوگا
اس کی دھڑکنیں ہوں گی

صوفیہ کے یہاں دل کی بڑی اہمیت ہے:

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل وہ ہے کہ جہاں تو سما سکے

یہاں شاعر نے دل کی اہمیت کو روایتی اور تاثراتی طور پر پیش نہیں کیا ہے، بلکہ تجزیاتی اور تجرباتی طور پر، تاکہ یہ نقوش دیرپا اور استوار رہیں، اُردو شعراء

ابھی اس طرح کے انداز گفتار سے نا آشنا ہیں :

وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے　　مری بجلی، مرا حاصل کہاں ہے
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں　　خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے

ان ۳۲ نظموں کے مطالعہ سے اب یہ واضح ہو گیا کہ کلیم صاحب نے غزل سے قافیہ و ردیف کی پابندی سے قصداً اجتناب کیا ہے۔ وہ محبت کی چوٹ تو کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کا عشق شوریدہ سر نہیں، یہ خود آگہہ و خود شناس ہے، اس لئے دردمند نہیں۔ اسی لئے بقول عرفی دردمندی سخن کی کمی کا احساس کبھی کبھی ہو جاتا ہے :

بر آں تتبع حافظ رواست چوں عرفی
کہ دل بکاود و دردِ سخنوری داند

انھوں نے قدیم شاعری پر جتنے اعتراضات کئے اور جس طرح اس کو مریض کا ہذیان بتایا، شاید ہی کسی دوسرے نقاد نے ایسی جرأت کی ہو۔ لیکن ان نظموں سے یہ آشکار ہو گیا کہ قدیم شاعری کے جتنے محاسن تھے ایک ایک کر کے کلیم صاحب نے ان نظموں میں سمو دیا، ہاں اگر علی الزعم منحرف ہے تو قافیہ اور ردیف کی پابندی سے۔ اگرچہ اس پابندی سے نغمگی میں جو کمی آ گئی ہے، اس کی تلافی بھی کرتے رہے ہیں کہیں مدھر اور مدھم سروں میں، نغمے کی چھاؤں میں، کہیں نرم الفاظ کی رنگینیوں میں بندی ترکیب اور شبدوں کی مٹھاس میں۔ پھر بھی طبیعت جا بجا اضطراری طور پر قافیہ کی پابند ہو گئی ہے اور میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ساری کتاب ایک معمولی سی کوشش سے مقفّٰی شاعری بن جا سکتی ہے۔ مگر ان کو تو اس پابند شاعری سے بہر نوع آزاد رہنا تھا اگرچہ آزاد رہتے ہوئے بھی یہ سراسر آزاد شاعری نہیں کہی جا سکتی، یہ

معرّیٰ نظم اور مقفّیٰ نظم کے درمیان ایک مفاہمت ہے، خوشگوار، قابلِ تقلید، چنانچہ پروفیسر جمیل مظہری نے ایک نظم بہ انداز کلیم، لکھ کر اس فارم پر اعتبار و وثوق کی مہر ثبت کر دی ہے۔

کلیم صاحب، بے شبہ اپنے دور کے عظیم شاعر ہیں، بلکہ زبان اُردو کے وہ منفرد شاعر ہیں، جنہوں نے اس زبان میں رنگا رنگ تجربے کامیاب تجربے اور نئے تجربے کئے، اور اس طرح کہ گلچینِ بہار کو دامان تنگ کا گلہ کرنے کا موقع نہ رہا۔ چونکہ یہ تجربے نئے اور پہلے ہیں اس لئے الفاظ کہیں کہیں ناہموار آ گئے ہیں اور بعض بیان سجل نہیں معلوم ہوتے۔ خیالات و تجربات ایسے بھاری ہیں کہ اُردو داں طبقہ سے اٹھائے نہ بنے۔ لیکن انھیں بھلائے بھی نہ بنے، ہم جیسے بسیط اور تہ در تہ ماحول سے گذر رہے ہیں، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنے جذبات و تجربات کو بھی تہ در تہ، مبہم اور مرکب انداز میں پیش کیا جائے۔ تاکہ حیات زندگی کے ہر موڑ پر ان سے کام لے اور اپنی زیست کے سامان فراہم کرے۔ ایسا کرنے میں کلیم الدین احمد، بعض انگریزی شعراء کے رہین منّت ہیں، جنہوں نے تشبیہ، استعارے اور کنائے کی زبان میں جلے دل کے پھپھولے توڑے ہیں۔ مثلاً ڈان (Donne) براؤننگ (Brownings) اور شکسپیر (Shakespeare) ڈان کا اثر ان پر بنیادی معلوم ہوتا ہے، شاید یہی وہ شاعر ہے، جس سے یہ پہلے متاثر ہوئے۔ براؤننگ سے تاثر کا حال یہ ہے کہ اس کے معنوی شاگرد کہے جا سکتے ہیں۔ مگر الفاظ اور بیان میں ان کے یہاں جو سادگی و پُرکاری ہے، براؤننگ اس سے محروم ہے، براؤننگ کا اسلوب کھردرا ہے اور بانکپن لئے ہوئے (Rugged gran deur) شکسپیر کے متنوع تجربات زندگی نے ان کو بھی وسعت تجربات

عطا کیا ہے، اس کے ڈراموں میں جو المیہ ڈرامے ہیں، ان سے کلیم صاحب خاص طور پر متاثر ہیں۔ اس کے فلسفہ حیات کو زندگی کی اعلیٰ قدروں کا سنگ بنیاد سمجھتے ہیں

اس مجموعہ میں کلیم صاحب نے اُردو شاعری کو جس نئے امکان سے آشنا کرایا ہے، وہ ہے غزل لکھنے کا مغربی سلیقہ، انھوں نے جا بجا ڈرامیٹک مونولوگ (شخصی گفتگو) کے نمونے پیش کئے ہیں، ڈرامیٹک مونولوگ Dramatic monologue دراصل Soliloquy ہے۔ جس کو ہم خود کلامی کہتے ہیں، خود کلامی خاص ہے اور شخصی گفتگو عام ہے، ان دونوں میں وہی نسبت ہے، جو انسان اور حیوان میں ہے، ہر انسان حیوان ہے اور ہر حیوان کا انسان ہونا ضروری نہیں۔ اس طرح ہر خود کلامی، شخصی گفتگو ہے مگر ہر شخصی گفتگو کا خود کلامی ہونا ضرور نہیں ——— شکسپیر کے ڈراموں سے براؤننگ نے خود کلامی کا حصّہ چھانٹ کر اس کو ایک فن کے طور پر پیش کیا ہے، جس طرح کہا جاتا ہے کہ قصائد سے تشبیب چھانٹ کر غزل ایجاد کی گئی، پہلا طریقہ مغربی غزل کا تھا، دوسرا طریقہ مشرقی غزل کا ہے۔ دونوں ہی میں بنیادی طور پر تسلسل، نظم و ضبط اور معنویت تھی۔ مگر ایک اپنی بنیاد پر قائم رہی اور ایک اپنی بنیاد سے کھسک گئی کہ اس کی بنیاد ہی ہل گئی مشرقی انداز حیات اور توانائی و تنظیم کا شیرازہ جیسے جیسے بکھرتا گیا، ادب کا یہ فارم اس سے اثر لیتا رہا۔ یہاں تک کہ غزل کسی زمانہ میں عفونت کا سنڈاس بن جاتی ہے اور اس کے مطالعہ سے پورے معاشرہ کی سراندھ سے دم گھٹنے لگتا ہے۔ اس لئے ایسی غزلیں بھی میرے خیال میں خلا میں نہیں رہتیں، بلکہ حیات کے انداز پیش کرتی ہیں۔ غزل کی خام خیالی، غزل کی ریزہ کاری، غزل

کی پراگندگی، غزل کی سطحیت اور غزل کی عریانی و بے باکی، دراصل غزل گویوں کے معاشرہ کی خامکاری، پراگندگی اور عریانی کے آئینے ہیں۔ اس لئے غزل کے عیوب بھی ہنر بن کر سامنے آتے ہیں۔

مشرقی شاعری خصوصاً اردو شاعری کی جان مبالغہ ہے۔ کذب اور جھوٹے ڈھکوسلوں نے اس کو اپنے دودھ سے پالا ہے۔ مگر کلیم صاحب کے یہاں کذب و افترا کا گذر نہیں۔ ان کے یہاں حقیقت شاعری ہے اور شاعری حقیقت ہے۔ ان کے استعاروں اور تشبیہوں میں جا بجا مقامی رنگ نے ایسی کشش اور نکھار پیدا کر دیا ہے کہ ہر تجربہ اور ہر خیال ایک جہان تصوّرات لے آتا ہے فضل الرحمٰن صاحب نے اردو شاعری پر ایک نظر، پر مقدمہ لکھتے وقت ایک الہامی انداز میں یہ کہا تھا "کثرت استعارات اس کے شاہد ہیں کہ مصنّف کی طبیعت شاعرانہ ہے اور احساس و ادراک بہت زندہ،" آج ہم اس الہام کی حقیقت سے روشناس ہو رہے ہیں خود کلیم صاحب کہتے ہیں" شاعر اپنے عہد میں ادراک کے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے وہ بلبل کی طرح عالم بے اختیاری میں گاتا نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے سمجھ بوجھ کر کہتا ہے۔ بلند ترین ادراک کے ساتھ ساتھ اس کی قوت حاسّہ بھی غیر معمولی، تیز اور گہری ہوتی ہے۔ اسی قوت حاسّہ کا فیض ہے کہ وہ ماحول سے برابر اثرات قبول کرتا رہتا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ماحول سے دامن بچا کر نکل نہیں سکتا، مگر عظیم شاعر اپنے ماحول کو اپنے انداز میں لگا سکتا ہے۔ کلیم الدین احمد کی شاعری میں ہم ان دونوں خصوصیات کی جلوہ گری پاتے ہیں۔ وہ ماحول کے پروردہ بھی ہیں اور ماحول کے پروردگار بھی، اسی لئے یہ شاعری بھی خلا میں نہیں پرواز کرتی۔ اس کا بھی وہی ہندوستانی ماحول ہے، وہی افسردہ، محکوم، مجبور، عسیر الحال ماحول ہے۔ لیکن اس مجبوری پر

کلیمؔ صاحب نے اپنی سدا بہار طبیعت کا اثر ڈال کر اسے بھی خوشگوار و شاداب بنا دیا ہے۔ اس لئے کہ شاعری زندگی کا ماحصل اور اس کی تکمیل ہے۔

مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ ایک اور اہم خیال جو مرکزی انداز لئے ہوئے ہے وہ ہے ان کا صالح اعتقاد، انگریزی کی اعلیٰ تعلیم اور مغربی تہذیب کے گہرے اثر کے باوجود کلیمؔ صاحب مذہبی معتقدات کا مذاق نہیں اڑاتے، وہ مذہبی تلمیحات کو مانتے ہیں اور ان سے اپنے کلام کی توضیح و زیبائش میں کام لیتے ہیں۔ مثلاً حور و غلماں، باغ ارم، جنت و دوزخ، آدم و حوا، عرش، کرسی، خدا کا بار بار ذکر، اذان، الہام، ناقوس، طوبیٰ، لوح و قلم، چشمۂ حیواں، مسیحائی، شعلۂ طور، بال جبریل، چاند، زہرہ، مریخ، فلک، مسجد، مندر، پھر یہ کہ الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے پیش نظر خدا کی بستی، عرش بریں کو بتانا، یہ اسی شخص کا کام ہے جو مذہبی معتقدات، وراثت میں پایا ہو اور اس کی وراثت بھی ان اثرات کو قبول کر چکی ہو۔

اس مجموعہ میں بعض نئے الفاظ اور کچھ نئی ترکیبیں بھی آئی ہیں، کچھ فقرے شاداب، وپُر آب ہیں۔ کچھ ترکیبیں شاندار اور جاندار ہیں۔ مثلاً آہوں کی چبھن، رباط زریں، سبک رو فلک، ابر صاعقہ فگن، سیمگیں بہار، گلزریں۔ یہ لفظ حضرت امیر الدین وحیدؔ نے بھی استعمال کیا ہے۔ جن پر پروفیسر ایم۔ ایم مصطفیٰ میری رہبری میں کام کر رہے ہیں۔ شاہیں قطعاً ایک نئے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ شاہیں سے مراد ہم رفعت تخئیل ہی لیتے ہیں۔ مگر یہی رفعت خودی کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اس لئے ہم اس سے خودی کو بھی مراد لے سکتے ہیں۔ آنکھوں میں بلبلوں کی قندیل روشن ہونا، خون میں زنجیروں کا ابلنا، سانس میں زنجیروں کا پلنا اور چاند کو مفلس ازلی کہنا۔

استعارہ صرف تجربات ظاہر ہی نہیں کرتا، ان کو منظم و مرتب بھی کرتا ہے۔ بلکہ جذبہ اور فکر کی دوئی ختم کر کے ایک کو دوسرے میں ضم کر دیتا ہے، یہاں تک کہ کثرت وحدت میں بدل جاتی ہے۔ طویل نظموں میں جہاں ابتدا کثرت مشاہدہ سے ہوتی ہے استعاروں اور تشبیہوں کی مدد سے کثرت میں وحدت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مجموعہ میں کثرت سے استعارات اور تشبیہات مستعمل ہوئی ہیں، بعض استعارے غیر منطقی اور براہ راست سمجھ میں نہ آنے والے بھی ہیں۔ اس لئے کہ وہاں پر ایسے ہی خیالات کا اظہار مقصود ہے۔ ایسے مقامات پر رمزیت اور ایمائیت نے ایک خاص حلاوت پیدا کر دی ہے اور ایک خیال دوسرے خیال کو مہمیز کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

نظم ۱۳ میں ایسے ہی انوکھے لیکن شاداب استعارے اور تشبیہیں ملتی ہیں، ایک جگہ ملاحظہ ہو:

جب کہ ظلمتِ شب میں
نرم نرم ریشم سی
چاندنی فضاؤں میں
نور پھیل جاتا ہے

'نرم نرم ریشم سی' کی نزاکت اور معنویت پر غور کیجئے۔ 'چاندنی فضاؤں میں' یہ ٹکر ایکلیم صاحب کا اختراع کردہ ہے۔ لیکن ایک حقیقی تجربہ لئے ہوئے ہے۔ چاند کی کرنیں زمین پر بکھرنے سے پہلے فضاؤں کو جگمگاتی ہیں، فضاؤں کو چیرتی ہوئی زمین تک آتی ہیں اور آسمان سے زمین تک چاندنی پھیل جاتی ہے۔ زمین چونکہ کثیف ہے اس لئے یہ روشنی بکھر کر پھیل جاتی ہے۔ فضا لطیف اور نظیف ہے۔ اس لئے چاندنی کا احساس فضاؤں میں نہیں ہو پاتا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چاند اپنی روشنی

آسمان سے زمین پر براہ راست پھیلا رہا ہے اور فضاؤں میں اس کا وجود نہیں، لالٹین کو لیجئے، اسے روشن کر دیجئے۔ لیکن اس پر شیشہ نہ چڑھائیے۔ روشنی تو موجود ہے لیکن وہ پھیلے گی نہیں۔ اب شیشہ چڑھا دیجئے، تو روشنی ہر سمت پھیلی ہوئی معلوم ہوگی۔ روشنی دونوں حالتوں میں ایک ہی طرح کی تھی، فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر صورت میں اس روشنی کو ایک مادہ یعنی شیشہ مل گیا، روشنی پھیل گئی ــــ، آخری مصرع 'نور پھیل جاتا ہے' تحصیل حاصل کے طور پر نہیں لایا گیا ہے۔ چاند کی روشنی مادی روشنی ہے اور نور سے روحانی ضیا باری کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مادی اور روحانی ہر طرح کی روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ایک جدت اور بھی اس مجموعہ میں نظر آئی اور دوسرا مجموعہ بھی اس جدت سے الگ نہیں۔ کلیم صاحب نے خاصی تعداد میں دوسرے شعراء سے استفادہ کیا ہے، کہیں تو الفاظ کے الٹ پھیر سے دوسروں کے مصرعوں کو اپنا لیا ہے اور کہیں پورے کے پورے مصرعے لکھ دیئے ہیں۔ مگر اس کا اظہار نہیں کیا ہے کہ وہ دوسروں کے ہیں۔ یہ ایک بڑی آزمائش ہے قارئین کے لئے۔ مگر مقصد ان کا ہمیں آزمائش میں ڈالنا نہیں ہے بات یہ ہے کہ یہ مصرعے اور یہ اشعار کچھ اس طرح مضمون کے ساتھ کھپ گئے ہیں کہ اس امر کا ادنیٰ اشارہ بھی کہ یہ مصرع فلاں کا ہے، مضمون کی روانی اور اندرونی ترتیب کو مجروح کر دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصرعے کسی کے بھی لہجے ہوں، مگر اب وہ کلیم صاحب کے ہو کے رہ گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی پیش کش جس تیور سے ہوئی ہے، وہ اس انداز سے قطعاً مختلف ہے، جو ان مصرعوں کے کہنے والوں نے اپنایا تھا اور اب یہ مصاریع دوسرے معنی بیان کرتے ہیں ــــ میں ان مصرعوں کی نشان دہی کر کے آپ کے ذوق کو رسوا کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی طرح ان مضامین کے بہاؤ میں رخنے ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس لئے

اس امر کی دریافت کہ کون مرغ کس کا ہے۔ میں قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اقبالؒ نے بھی اسی حکمت سے کام لیا ہے اور اس کا اثر اچھا مرتب ہوتا ہے۔

کلیم صاحب کو اردو شاعری کا ایک معیار قائم کر کے دکھانا تھا۔ ایسی شاعری کا نمونہ پیش کرنا تھا، جو وحشی نہ ہو، سیاسی نہ ہو، قومی نہ ہو، جھوٹی نہ ہو، پراگندہ خیالوں کا گلدستہ نہ ہو، روزی روٹی کا نعرہ نہ ہو، سرمایہ دار اور مزدور کا پروپگنڈا نہ ہو، اوہام باطلہ کا مجموعہ نہ ہو، یہ سب نہ ہوتے ہوئے بھی یہ سب کچھ ہو، مگر:

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال کے محرم نہیں پیرانِ طریق

وہ شاعری کو روح کی آسودگی کا موجب قرار دیتے ہیں کہ روح کی آسودگی جسم کو صحت مند اور مطمئن رکھتی ہے، انسان کو جسمانی ضرورتیں برابر اپنی طرف بلاتی رہتی ہیں۔ ان کی پکار پر لبیک کہنے والا کچھ ایسے طور پر زندگی کے دن کاٹنے لگتا ہے کہ اس میں اور ایک جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اسے جسم کی غذا تو مل جاتی ہے مگر روح اس کی برابر بھوکی رہتی ہے جس سے اس کا اندرون ناآسودہ رہتا ہے۔ اندرونی ناآسودگی اسے غیر مطمئن بنا دیتی ہے، اگر کسی شاعر نے یہ بھید پا لیا، تو وہ اپنی زندگی میں ایک فردوسی آسودگی محسوس کرنے لگتا ہے اور پھر یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ دماغی اور روحانی سکون کا نتیجہ ہے جسمانی سرور۔ کلیم صاحب اس معیار پر پورے اُترے ہیں، اور بقول آرنلڈ:

"More and more mankind will discover that we have to turn to poetry, to interpret life, to console us, to sustain us"

تجربات کرنے کی تحریک سے متاثر ہے۔ یہ سارے تجربات شعوری اور سنگین کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اس پر انگریزی لب و لہجہ کا پرتو نمایاں ہے۔ کلیم صاحب 'عید کے دن'، 'پیام دید' کے دن اور علیش کی تمہید کے دن اپنے چمن سے، اپنے وطن سے دور بہت دور تھے۔ عید کی ساری مسرتیں انہیں کسی 'گل کی یاد' دلا کر ان کے رگِ احساس کو جھنجھنا دیتی ہیں اس لئے شادمانی و شاد کامی ہر چہار سمت فضائیں کھلی ہوئی ہونے کے باوجود وہ شادمان و شاد کام نظر نہیں آتے۔ عید میں سبھی خوش تھوڑے ہی ہوتے ہیں، اسی عید کے دن ایسی بھی ہستیاں ہوتی ہیں، جو میلے کچیلے کپڑے پہنے بھوک کی شرم سے سر نیچے کئے ہوئے سامنے سے گذر جاتے ہیں، مگر یہاں کلیم صاحب کی آسودہ طبیعت اور مرفہ الحالی جھلک جاتی ہے اور ان کی افتاد طبع کو ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن سوزشِ نہاں اس مرفہ الحالی پر چھا جانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے اور شاعر کو تعجب ہو رہا ہے کہ

کیوں خوشی ہے میری نظروں سے نہاں

حالانکہ شاعر کے اِرد گرد، آمنے سامنے ہر طرح کے سامان سرور و انبساط ہیں۔ ہر طرف شورِ نا و نوش ہے، ہر جوان مست مینا بدوش ہے، ہر مہ جمال جلوہ فروش ہے اور رہزن تمکین و ہوش ہے۔ مگر شاعر کا اندرون، اس کا دل، بیکل ہے۔ وہ ایک کرب میں ہے، ایک آزمائش میں ہے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے "اب آنکھ کسی پہ کیا ڈالوں، بچتا ہی نہیں نظروں میں کوئی"۔ یہی تیور ان مصرعوں میں دیکھئے:

صبحِ عید آئی، مگر دل ہے حزیں　　گردِ کلفت سے ہے آلودہ جبیں

اے ہم نشیں

کیوں خوشی ہے میری نظروں سے نہاں

(انسان اچھی طرح دریافت کرے گا کہ ہم سب کو شاعری کی طرف اس لئے متوجہ ہونا ہے کہ ہم اپنی حیات کی ترجمانی کرسکیں، اس سے اپنی تسکین کا سامان فراہم کریں اور مصیبتوں کو سہنے کے لائق بن سکیں) اور اب اسی طرح کی شاعری سے اردو داں طبقہ زیادہ سے زیادہ سہارا پائے گا اور یہی انداز اسے ایک بلند تقدیر کی طرف لے جاسکے گا۔ شاعری صرف رازِ کائنات کو ہی بے نقاب نہیں کرتی ہے۔ بلکہ شاعر کے دل کو بھی ٹٹولتی ہے اور اس کے شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی تہوں کو بھی ابھار کے رکھ دیتی ہے۔ کلیم صاحب نے ہر طرح کے لٹریچر کا مطالعہ کیا، تاریخ انسان کے زریں باب کو پڑھا ہوگا، جبکہ انسان خلیفۃ اللہ تھا اور خدا بھی اس کو خلیفۃ اللہ سمجھتا تھا، رفتہ رفتہ یہ احساس، ظلمت و جہالت کی بدلیوں میں کھو گیا، یہی ایک جذبہ ہے جس نے ان کو خدا کی خدائی اور خدا کی کارسازی پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو

—س۔ب

ڈاکٹر صدرالدین
کی دیگر تصانیف

۱ بنیان اللسان

۲ انتخاب کلام درد

۳ چند مقالات شبلی

۴ شاہ آیتہ اللہ جوہری انکی حیات اور شاعری

۵ علم العروض

(۳) ستائیس مصرعوں کی یہ نظم بڑی ہلکی پھلکی مچلتی ہوئی اور پھسلتی ہوئی ہے۔ شاعر نے اپنے دل میں ایک دنیا بسائی تھی، وہ الگ تھلگ اپنے لیے آرام کا ایک گوشہ چُننے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مگر اس کا آرام، دستِ قضا نے لوٹ لیا۔ اس کی مسرتیں کافور ہو گئیں۔ دنیا میں جانے کتنے ہی نقش اس طرح ناپائیدار بنے اور رہے، رہے اور مٹے۔ شاعر نے اپنے دل میں جو شمع جلائی تھی وہ گُل ہو گئی۔ وہ پھول جو اس کے مشامِ جاں کو معطّر کیا کرتا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا، شاعر ایسی بے بسی کے عالم میں بھی توازن نہیں کھو بیٹھتا اور سنبھلا ہوا انداز رکھتا ہے۔ یاس و نامیدی کی اس منزل پر صرف خدا کا ہی نام ہے، جو غریبوں اور امیروں سب کے لئے یکساں سہارا بن سکتا ہے کلیم صاحب کہتے ہیں کہ اے صانع حقیقت کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ ہماری ہستی نقش ابد بن جائے، تاکہ دن رات انسان اپنے 'کلوں' کے فراق میں گھُل گھُل کے مرنے سے نجات پائے اور اس کی ساری توانائیاں کسی دوسرے ضروری فریضہ کی ادائیگی میں خرچ ہوں، وہ اپنے غم سے دنیا کے غم کا اندازہ کرتے ہیں اور ہمیں زندگی کا ایک مفید فلسفہ بتاتے ہیں۔ ایسے وقت میں انسان اپنا غم غلط کرنے کے لئے اسی طرح اپنے کو سنہرے خیالات اور تلخ حقائق کی زنجیروں میں یکساں باندھ دیتا ہے۔ کاش یہ زندگی محزوں نقش ابد بن سکتی ——— اس آہ دم بہ دم کو
صورت گرِ عدم کو
اے صانع حقیقت
نقشِ ابد بنا دے

مضمون کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو یہ نظم کلیم صاحب کی لندن کی واپسی کے

میں اس کتاب کو اپنے شفیق استاد مرحوم
علّامہ سیّد عظیم الدین احمد عظیم پی۔ ایچ۔ ڈی (لیپزائیگ)
کے نام معنون کرتا ہوں

صدرالدین

مطبوعہ
بیسل لیتھو پریس، رمنہ روڈ۔ پٹنہ ۴

کئی سال بعد کی لکھی ہوئی ہے، الفاظ حسب دستور نرم اور سہل ہیں اور یہی انداز اس نظم کی حیات کا ضامن ہے، اس میں وہ وفور جذبات میں گم ہیں اس لئے الفاظ اور خیالات اور بھی معمولی سادہ اور سبک ہیں، جن سے اثر کی نشتریت بڑھ گئی ہے۔

وہ پھول جس کی نکہت
جاں تھی مرے چمن کی
وہ شمع جس سے زینت
تھی اپنی انجمن کی
نظروں سے اب نہاں ہے
اے پھول تو کہاں ہے
اے شمع کیوں نہاں ہے

(۴) اٹھارہ مصرعوں کی یہ نظم بڑی پیاری ہے، اس کا بھی وہی تیور ہے بیکلی اور مایوسی۔ کلیم صاحب نے اپنی مایوسی میں ایسا انداز رکھا ہے کہ بذات خود جاذب توجہ بن جاتی ہے۔ ایسی ناکامیاں انقباض اور افسردگی طاری نہیں کرتیں۔ ایسی حرماں نصیبیاں دل میں ایک گدگدی پیدا کرتی ہیں۔ یہ انداز ناکامیوں سے کام لینے کا میر نے بھی اپنایا تھا۔ مگر میر کا لب و لہجہ خستگی اور پژمردگی سے معمور تھا۔ کلیم صاحب کا بیان شگفتہ ہے اور حقیقتاً ان کا دل حیران و تماشائی بن کر سامنے آتا ہے۔ اس نظم پر بھی مرثیت کا اثر ہے۔ مگر چونکہ وہ بالطبع باغ و بہار ہیں۔ اس لئے اس پر گریہ گلوگیر کا رنگ نہ چڑھ سکا۔ میں نے کلیم صاحب کو باغ و بہار کہا ہے اور وہ باغ و بہار ہیں مگر اکثر صرف اپنے لئے دوستوں کے لئے نہیں اور یہ راز اس وقت فاش ہوتا ہے، جب آپ گھنٹوں ان کے نزدیک بیٹھئے اور انہیں بولنے پر مجبور کیجئے۔

شاعر نے ایک حسین تتلی کو دیکھا تھا، پایا تھا اور اپنے ساتھ بسایا تھا۔ مگر وہ خوش رنگ تتلی، جو نور کی موجوں پر، اک شعلۂ رقصاں تھی، وہ خاک میں پنہاں ہو گئی، گم ہو گئی۔ وہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ میں نے سب کچھ خواب میں دیکھا تھا، اس کو حقیقت سے کوئی لگاؤ نہ تھا، ورنہ حقیقت اتنی جلد آنکھوں سے نہاں نہیں ہوتی ہاں خواب کی دنیا تارِ عنکبوت کی طرح دیکھتے دیکھتے ٹوٹ جاتی ہے؛ اس کے نہاں خانۂ دل میں صدہا اضطراب کروٹیں لے رہا ہے۔ اس کا اندرون سوزِ نہاں سے جل رہا ہے۔ مگر اپنا یہ اضطراب اور اپنا یہ سوزِ نہاں شاعر خاموشی سے برداشت کرتا جاتا ہے۔ زبان پر ایک بھی حرفِ شکوہ نہیں۔ وہ مبہوت ہے فرطِ غم میں لبوں پر مہرِ سکوت ہے اور یہ کہکر رہ جاتا ہے۔

یا رب یہ مرا دل ہے
یا خوابِ پریشاں ہے

کلیم صاحب اپنے جذبات کی مصوری میں کامیاب ہیں۔ معمولی اور سادے الفاظ میں معنویت ایسی بھر دی ہے کہ پڑھنے والا بھی ان جذبوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سارے خیالات کو ایسا جذباتی اختصار بخشا ہے کہ پڑھیے اور دیر تک سر دھنیے۔

پھر خواب کی دنیا میں
لیکن وہ مری تتلی
خوش رنگ حسیں پیاری
جو نور کی موجوں پر
اک شعلۂ رقصاں تھی
لو خاک میں پنہاں ہے

(۵) بہ ظاہر یہ ایک منظری نظم ہے۔ اس میں ستائیس مصرعے ہیں، ہلکے، پھلکے، اور بے ساختہ اسماعیل میرٹھی کے انداز کی یہ نظم نئے قالب میں ایک گیت ہے انگریزی اندازِ بیان، انگریزی طرزِ تخیّل لئے ہوئے مگر حقیقت میں یہ نظم بھی پہلی چار نظموں کی طرح محرومی، و ناکامی کے کینوس پر پھیلی ہوئی ہے۔ انداز ہے مغربی اور جذبہ ہے مشرقی۔ ہیئت تو انگریزی نظم کی ہے مگر مواد اس میں مشرقیت لئے ہوئے ہے۔ ابرِ رحمت کی رحمت کو بیدار کرنا اور اس طور سے کہ اس کو غیرت بھی آجائے۔ یہ کلیم صاحب کے مشرقی رجحانات کا اثر ہے۔

الفاظ سادگی اور نرمی سے اس حد تک بھرے ہوئے ہیں کہ اس نظم پر غنائی گیت کا رنگ آگیا ہے، جذبات بہ ظاہر قابو میں ہیں، مگر اندرون شاعر کا ابرِ رحمت کی فراموش فطرت نے بے قرار کر دیا ہے:

وہ کھیت اپنا ویراں پڑا ہے
اے ابرِ رحمت
اب سر پہ تیرا سایہ کہاں ہے
سورج اب آتش برسا رہا ہے
خنجر سے گویا برما رہا ہے

یہ نظم شاعر کے اس تیور کی غماز ہے جس کے بھاری بھرکم اشارات بعد کی نظموں میں ملتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اپنی زمین کی سنگلاخی اور اپنے آسمان کی بیرحمی سے گھبرا رہا ہے۔ اس سرزمین کو کسی رہبر کی ضرورت ہے، ایک انسان کی ضرورت ہے، کسی دانائے راز کی ضرورت ہے، ایک جویائے حقیقت کی ضرورت ہے، ساری زمین پیاسی ہے، پتھر ہے۔

ساری جڑیں اب مرجھا گئی ہیں
سب تشنگی سے جاں دے رہی ہیں
کچھ مر چکی ہیں، کچھ مر رہی ہیں
بیتاب ہو ہو کر کہہ رہی ہیں
اے ابرِ رحمت، سیراب کر دے
سیراب کر دے

وہ علاماتی انداز (SYMBOLISM) جس سے کلیم صاحب ہر موڑ پر کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس نظم میں اس کی تخم کاری ملتی ہے، یہ علامتیں دبیز ہیں، تہ دار ہیں، وہ اپنی تنہائیوں سے پریشان ہیں، اپنے پُرخلوص اور بلند خیالات کو کسی کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں، انہیں ایک جیون ساتھی چاہیئے۔ انہیں اپنے تخیلات کی دنیا بسانے کے لئے کوئی سامان چاہیئے

ہے خشک ساری کھیتی ہماری
سیراب کر دے
کیا لہلہاتا تھا کھیت اپنا
اے ابرِ رحمت
وہ کھیت اپنا ویران پڑا ہے
اے ابرِ رحمت
تیرا کرم تھا تو سر پہ اپنا
سایہ کئے تھا، تو نے زمیں کو
پانی دیا تھا، پودوں کو تو نے

زندہ کیا تھا، اے ابر رحمت
سیراب کر دے

(۶) ۱- ۵ تک ہر نظم میں ایک ناآسودگی اور اندرونی درد کی ٹیس ہے پانچویں نظم میں کلیم صاحب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مستجاب ہوئی اور اب چھٹی نظم کا لہجہ بدل گیا ناکامی کے خوض کامیابی اور افسردگی کے بعد شگفتگی ہاتھ آگئی ساری نظم میں ایک امنگ ہے، ایک ترنگ ہے، جو پڑھتے ہی دل میں ایک خاص رنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اس نظم کا طریبہ انداز بڑا ہی کامیاب ہے، یہاں بھی الفاظ چلکدار اور سادہ ہیں مگر اثر لئے ہوئے ہیں، جیسے کوئی کسی سے باتیں کر رہا ہو،

تپتی ہے زمیں ساری
جاندار پریشاں ہیں
سب پیاس سے حیراں ہیں

اس کے بعد ہی وہ ناآسودگی اور درد و غم کافور ہو جاتا ہے، ابر رحمت کو مجبور سیرابی ہونا پڑا۔

سیراب ہیں سب پودے
سیراب زمیں ساری
سیراب زماں سارا
سیراب مرا دل ہے

زندگی کے دونوں رخ کو پیش کر کے شاعر نے یہ بتلا دیا ہے کہ شادی و غم جہاں میں توام ہے اور زندگی کے لئے ناگزیر ہے۔ انسان کو گھبرانا نہ چاہیئے، ہر درد کا مداوا ہو گا اور فطرت کبھی اپنے زخمیوں کو بھول نہیں سکتی، اسی طرح انسانی وقار

برقرار رہتا ہے، إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (بے شک تکلیف کے ساتھ راحت ہے)
تینتیس ۳۳ مصرعوں کی یہ چھوٹی سی نظم کلیم صاحب کے دل کی شادابی پر دلالت کرتی ہے،
کرب اور الم کبھی ان کا محور تصور نہ بن سکا، وہ غم سے کبھی مغلوب نہ ہوئے۔
اس لئے کہ ان کے نزدیک دنیا اپنی تمام خرابیوں اور گھناؤنے پن کے باوجود ترقی
کی طرف گامزن ہے اور رفتہ رفتہ شر خیر کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے، اسے
انگریزی میں (MELORISM) کہتے ہیں۔ اسی لئے کائنات میں جہاں شر ہے وہاں
خیر بھی ہے، یہاں تک کہ ابلیس جو شر محض کا پیکر ہے، اس نے بھی اپنی شرانگیزیوں
سے آدم کو اُبھرنے کا موقع دیا ـــ اب عالم ویراں میں، تغیر کا عالم ہے، ہر چیز شگفتہ
ہے، شاداب ہے، خزاں ہے، اس ابر کے دامن میں، پنہاں کوئی جادو ہے۔

(۷) حقیقت کے رسیا ہوتے ہوئے بھی کلیم صاحب کو مجاز سے کام لینا ہی
پڑا کہ " بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر"

یہاں استعارہ کی زبان اپنانا پڑی ہے اور چند الفاظ علامانی طور پر مستعمل ہوئے
ہیں۔ اپنے گرد و پیش سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے
وہ کامیاب ہے۔ شاعر دنیا اور اہل دنیا کی ترقیوں کا ذکر کرتا ہے، فلک ان کی
اس ترقی کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی طرف بھی واضح اشارہ ہے، انسان
نائب خدا نہیں بلکہ نائب شیطان بن کر رہ گیا ہے۔ جس پر اپنے غم و غصہ کا اظہار رعد
اپنی گرج سے، بجلی اپنی کڑک سے، اور ہوائیں اپنی سنک سے، کر رہی ہیں۔ فطرت
ان سے رنج ہے، شاعر کو بھی تعجب ہے کہ یہ دنیا کی کشتی کدھر جا رہی ہے،
جدھر جا رہی ہے، چلی جا رہی ہے، ان ترقیوں کا انجام کیا ہوگا۔ خالق و مخلوق کے
رشتوں کو استوار کرنے کے بجائے توڑا جا رہا ہے۔ حالی نے بھی مسلمانوں کی

زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا:

یہی حال دنیا میں اس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آ کے جس کا گرا ہے
کنارا ہے دور اور طوفاں بپا ہے — گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

انسان، انسان بننے کے بدلے حیوان بن رہا ہے۔ اس لئے "چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے۔ نخوست پس و پیش منڈلا رہی ہے" اور اب شاید موت اس کا علاج کر دے۔ اس لئے اجل کی یہ پیہم صدا آ رہی ہے۔ "اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں" اجل بیدار کرنے کے لئے نہیں، بلکہ سُلا دینے کے لئے آیا کرتی ہے، اب جو لوگ سوئے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے سو جائیں گے اور جو جاگ جائیں گے موت کے پنجہ سے بھاگ جائیں گے اور امر ہو جائیں گے، شاعر مضطر ہے، وہ فطرت کی تعزیروں سے واقف ہے۔ اس دار و گیر کے دور میں جو جاگتا ہے، وہی پاتا ہے اور جو سوتا ہے، وہ کھو دیتا ہے۔ ع ایسی دار و گیر میں تبدیلی قسمت چاہیئے۔

اس نظم میں حالی کے ناصحانہ تیور اور اسماعیل میرٹھی کے اصلاحی انداز گلے مل رہے ہیں اور ان دونوں کے ملا دینے سے ایک تیزی آ گئی ہے ایک تندی پیغام میں آ گئی ہے — اور کلیم صاحب کو اگر پیغام گو شعرا کے زمرہ میں داخل کر لیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ فرق یہ ہے کہ حالی مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہیں، کلیم صاحب انسانیت کے بارے میں، اسماعیل کے یہاں ہلکے انداز میں صبح کہہ رہی ہے بچوں سے۔ یہاں سنجیدہ اور با وثوق تیور کے ساتھ اجل کہہ رہی ہے، اس لئے کہ اب بقا کا سوال درپیش ہے۔

پوری نظم علامتی اشاروں سے بھری ہوئی ہے۔ اسے نیم اصلاحی اور نیم سیاسی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ۲۴ مصرعوں کی یہ چھوٹی سی نظم اپنے اندر ایک جہان معنی سمیٹے ہوئے ہے، شاعر دنیا کا سفر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس کا تعجب ابتدا سے انتہا تک برقرار ہے، اس لئے کہ حالات بدل نہیں رہے ہیں۔ دنیا کلجگ کی طرف اور بھی تیزی سے دوڑتی جا رہی ہے اور انسان کی زندگی اس طرح ہچکولے کھا کھا کر بڑھتی ہی جا رہی ہے:

یہ دنیا کی کشتی کدھر جا رہی ہے
وہ دُھندلی سی دیکھو نظر آ رہی ہے
تھپیڑوں سے موجوں کے تھرّا رہی ہے
چلی جا رہی تھی، چلی جا رہی ہے
وہ طوفان اٹھا

مسلسل ہوا شور و غل کر رہی ہے
چمک ہر گھڑی برق دکھلا رہی ہے
گرج دم بہ دم رعد کی ہو رہی ہے
زمیں آسماں سے گلے مل رہی ہے
کدھر ہے وہ کشتی

(۸) آٹھویں نظم پچھلے سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ ساتویں نظم میں شاعر نے دھرتی کے باسیوں کو یہ کہکر متنبہ کیا تھا کہ دُنیا کی کشتی کدھر جا رہی ہے۔ تباہی اور بربادی کا طوفان برپا ہو رہا ہے، ۱۷ مصرعوں کی اس چھوٹی سی نظم میں شاعر بتاتا ہے کہ تباہی کے سامان اور بھی نزدیک آ گئے، ہر طرف شعلے دکھائی پڑ رہے ہیں، توپوں

کی گرج سے آسمان زمین کانپ رہے ہیں۔ دنیا سے امن و سکون رخصت ہو گئے۔ جنگ کی بربادیاں لوریاں دے رہی ہیں، اب تباہی یقینی ہے۔ دیو فساد انسانوں کی "نادانوں" کی عقل پر ہنس رہا ہے۔ وہ ساری کائنات پر ہنس رہا ہے کہ کس طرح آن کی آن میں سب کے سب جھلس کے رہ جائیں گے۔

کلیم صاحب نے یہاں ایسا تجربہ اور ایسا خیال پیش کیا ہے جس سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔ وہ جنگ کو انسانی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی وہ غیر جانبدار نظر آتے ہیں انہوں نے اپنی ذات اور اپنے رجحان کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے، یہ نظم بھی علامتی اشاروں سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے باوجود وضاحت بیان کے ابہام پیدا ہو گیا ہے، غزل کی جان ابہام ہے۔ کلیم صاحب اس جان غزل کو اپنی نظم میں بسا کر ہمارے سامنے بہت سارے سوالیہ نشانات پھیلا دیتے ہیں اور یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں :-

ایک تارا بھی نظر آتا نہیں
تیرگی دنیا میں ہے چھائی ہوئی
جس طرف دیکھو ادھر دیو فساد
خندہ زن ہے عالم ایجاد پر
آج ہیں ناشاد وہ کل تھے جو شاد
برق ہنستی ہے مری بنیاد پر
کالے بادل اٹھ رہے ہیں ہر گھڑی
روشنی سورج کی مدھم پڑ گئی

(۹) کل دس مصرعوں کا یہ ننھا منا قطعہ ہے، خیالات کے اعتبار سے یہ آٹھویں نظم سے منسلک ہے، جنگ اپنی سیاہ کاریاں دکھلا چکی، تو اب دنیا کا نقشہ بدل جانا کوئی

حیرت کا مقام نہیں۔ اپنی پیاری پیاری زمین جو کبھی قدرت کے ہاتھوں بنی سنوری تھی۔ آج سونی سونی سی ہے، ویران ہے، برباد ہے۔ شاعر نے کچھ لطیف طنز کے نشتر بھی لگائے ہیں۔ وہ اور کچھ نہیں کہتا ہے۔ بس یہی اس کی زبان پر ہے:

گلشنِ دہر ہو گیا برباد
اِک دھواں سا زمیں سے اٹھتا ہے

جنگ میں قتل و غارت، عناد و رقابت اپنی انتہا کو پہنچ ہی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک حساس دل پر اس کا اثر ہونا ضرور تھا۔

کیسی صورت بدل گئی دل کی
اس پہ چھائی ہوئی ہے ویرانی

جنگ کے مہیب اثرات سے شاعر بھی نفرت کرتا ہے۔ مگر اس نفرت کا اظہار ایک نئے انداز سے ہوتا ہے۔ صلح اور شانتی بہر حال انسانیت کی قدریں بڑھانے اور بلند کرنے کے لئے بنیادی صفات ہیں کہ انسانیت کی بنیاد انہی پر ہے، شاعر امن کی آراستگی اور شانتی کی خوبیوں کا ذکر نہیں کرکے جنگ کے مہیب نتائج بتا دینے پر اکتفا کرتا ہے اور فیصلہ انسانیت کے سپرد کر دیتا ہے:

شاد کیسے ہو، اب دلِ ناشاد
گلشنِ دہر ہو گیا برباد
اِک دھواں سا، زمیں سے اٹھتا ہے

(۱۰) مخمس کی شکل کی یہ چھوٹی سی نظم کل دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے پانچ مصرعے ماسبق سے ملے ہوئے ہیں.... زندگی کی بے نشانی، گلشن کی پامالی، باغبانوں کی بدحالی جو جنگ کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہاں بیان کی گئی ہیں، زندگی کے سوتے سوکھ گئے۔ نہال

زیست کا راز مجھے ان سے بیاں کرنا ہے
جن کی قسمت میں ہے عالم کا نگہباں ہونا

ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم

انسانیت کھُلا کر رہ گئے، شہر ویران ہو گئے، آبادیاں لُٹ گئیں۔ شاعر ہماری توجہ اس کی طرف منعطف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھ کیا ہو گیا! دوسرے حصّہ میں امید کی جوت جگمگاتے ہوئے کلیم صاحب سامنے آتے ہیں اور زندگی کو قابلِ زیست بنانے کے سامان مہّا کر دیتے ہیں۔ وہ مژدہ سُناتے ہیں کہ مردہ شاخوں میں تازہ جان آ گئی، پتّیاں نکلیں، پھول بھی پھولے، حسن رنگیں شباب پر آیا، کیسا دنیا نے روپ بدلا ہے۔ ہمیں اس طرح یہ دکھا دیا گیا کہ تباہیاں اکثر و بیشتر آبادیوں کی بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ یہ تباہیاں انسان کی خدمت کے لئے اور اس کی فلاح و بہبود کی خاطر لائی جائیں، وہ اپنے شعور و لاشعور میں حسن و شباب کی رنگینیوں کو جگہ دیئے ہوئے ہیں اس لئے ایسے استعارے ان کے ذہن کو ایک طرح کی تسکین بخشتے ہیں اور وہ چُپ ہو جاتے ہیں، مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

شعلۂ زندگی بھڑک اُٹھا
مُردہ شاخوں میں تازہ جان آئی
پتّیاں نکلیں پھول بھی پھولے

حسنِ رنگیں شباب پر آیا
کیسا دنیا نے روپ بدلا ہے

---

(۱۱) جن جن تجربوں اور مرحلوں سے انسان گذرتا ہے، یا گذرا ہے۔ ان کا وجود شعور، تحت شعور اور لاشعور میں تہہ در تہہ رہتا ہے، ان خواہشوں کو، ان خوابیدہ تجربوں کو دبا دینے یا چھپا دینے کی کوشش سے ردعمل پیدا ہوتا ہے، اگر یہ تمنّائیں اور

یہ خواہشیں آسودہ ہوگئیں۔ یا ان کا رخ کسی دوسری طرف مڑ گیا اور ان سے اچھا کام لیا گیا، تو یہ تجربے اور خواہشیں مرتب اور منظم ہو جاتی ہیں، ورنہ یہ انسانی وجود کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہیں، شاعر کہتا ہے کہ انسان کا دل ہی سب کچھ ہے۔ سارے نقوش اسی پر ثبت ہوتے ہیں، انسانی حیات بھی جن منزلوں سے گذر رہی ہے، وہ سب کی سب دماغ انسانی میں محفوظ ہیں اور انسان کے دل پر مرتسم ہیں۔ یہاں دماغ اور دل کے باریک فرق کو بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ اگر ان تجربوں کو ظاہر ہونے کا موقع نہ ملا اور ان کا رخ کسی اچھے تجربے کی طرف نہ موڑا گیا، تو پھر یہی تجربات انسان کو ابتدائے تخلیق کی حیوانی منزل کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ اس لئے کہ 'جنگل ہے میرے دل میں، میداں ہے میرے دل میں، اور گلشن ہے میرے دل میں۔ کلیم صاحب خود کہتے ہیں "فطرت انسانی میں بربریت اس وقت تک کارفرما ہے اور ذرا سی تحریک پر تہذیب کے حلقوں کو توڑ کر باہر نکل آتی ہے" (اردو شاعری پر اک نظر حصہ اول صفحہ ۴۶) اور یہ شاید فرائڈ۔ اس ایلیٹ کا اثر ہے PSCYCHO ANALYTICAL CONCEPTION سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی دماغ، انسانی حیات کی طرح ارتقا پذیر ہے اور غیر شعوری پردوں میں وہ ساری کیفیات پنہاں رہتے ہیں، جو ذرا سی تحریک پر ہمارے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

۳۱ مصرعوں کی یہ نظم عجب طرح کی رمزیات سے معمور ہے۔ الفاظ ملائم ہیں، معمولی ہیں۔ مگر ان کے استعمال نے ان میں ایسے معنی رکھ دیئے ہیں کہ نظم کو اچھی طرح سمجھنے میں پسینے چھوٹ جائیں، اس کا پہلا مصرع ہماری رہبری کرتا ہے:

تاریک آسماں ہے، تاریک ہے زمیں بھی

اور اس کے بعد آخری مصرع پڑھیئے 'یہ کون جھانکتا ہے، جنگل کی جھاڑیوں سے،

تو پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اس نظم میں کلیم صاحب نے بڑے ہی رچے ہوئے شعور کا درس دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے، اپنے گرد و پیش، اپنی زمین اور اپنی آسمان کے نیچے انسان دورِ وحشت کے انسان کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ کروڑوں سال کے ارتقائی عمل کے باوجود دورِ حاضر کا انسان ابھی تک وحشت و بربریت کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا ہے، نہ تو اس کی تمام وحشتیں آسودہ ہو سکیں اور نہ ہی ان کا رُخ کسی اچھے کام کی طرف موڑ کر انہیں منظم و مرتب کیا گیا۔ (DISCIPLIN) اس لئے ترقی کے اتنے سارے زینے طے کر لینے پر بھی ابتدائی زینوں کو وہ فراموش نہ کر سکا اور اکثر اس کا ردِ عمل ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ یہ انسانی ذہن کا ارتقا ہے، یا تنزّل۔ جس نقطہ سے ابتدا ہوئی، انتہا پر بھی وہی نقطہ ایک دائرہ بن کر ہم سب کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے نظر آتا ہے، یہ نظر کا فریب تو نہیں۔۔۔ نہیں یہ حقیقت ہے۔ آدم کی پہلی آبادی، یعنی جنگل کے دور سے لے کر ابھی تک آدم کا پہلا تصوّر جھانک رہا ہے۔ اس کی دیرینہ خصلتیں پکار رہی ہیں، یہاں خوں خوار درندے ہیں، جبر و ستم ہیں، مجبوریاں ہیں، ترغیب گناہ ہے، تحریص نگاہ ہے۔ اور ابھی تک انسان اپنے ایسی گھروندے میں خوش ہے انسان خواہ مشرق کا ہو، خواہ مغرب کا، علی قدر مراتب ہر جگہ ایک طرح کا انسان زندہ ہے۔ وہ تہذیب و تمدّن کی کسی منزل پر ہو اس کا آدم برابر جیتا جاگتا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ نے جبلّتوں کے بدلنے کی رسم تو رکھی نہیں لا تبدیل لخلق اللہ۔۔۔ پھر شاعر دوسرے خیال کی طرف لوٹتا ہے کہ آدم کو تو آدمیت سے مالا مال ہونا چاہیئے اور ایک وقت ایسا ضرور آئے گا، جب ہماری تہذیب ایسا آدم سامنے لائے گی۔ جو

واقعی نائب خدا ہوگا۔ دنیا کا عمل ارتقا جاری ہے۔ جنگل کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے۔

تاریک آسماں ہے، تاریک ہے زمیں بھی
جنگل سے کچھ بھیانک آواز آ رہی ہے
لیکن یہ باغ میرا، شاداب و پُرفضا ہے
ہر نخل بارور ہے، ہر شاخ باثمر ہے

تب ہم یہ کہیں گے، لیکن یہ باغ میرا شاداب و پُرفضا ہے، ہر نخل بارور ہے، ہر شاخ باثمر ہے، ہر غنچہ کھل رہا ہے، یہ باغ میرا دل ہے، جنگل بھی میرا دل ہے ـــــ اس کے بعد یہ راز بھی آشکار ہو جائے گا کہ انسان کی جبلّت وحشت و بربریت ہے، یا آدمیّت و انسانیت۔

۳ ـ ۱۱ تک نظمیں معاصر میں شائع ہو چکی ہیں، پہلی دو نظموں اور ان نظموں کے درمیان کچھ خلا معلوم ہوتا ہے۔ گرچہ خلا محال ہے، ان نظموں میں دردمندی سخن جھانکتی نظر آتی ہے۔

(۱۲) ۲۹ مصرعوں کی یہ نظم پوری کی پوری سہل ممتنع کی بڑی اچھی مثال ہے، الفاظ مدھم، روزمرہ کے، چھوٹے چھوٹے، بیان سجل اور رواں مصرعے مختصر اور نرم، مگر خیالات طویل اور گرم، بہ ظاہر ایسی نظم کہہ لینا سہل معلوم ہو۔ مگر اس کو برتنے میں ساری قلعی کھل جائے اور پھر ہر طرح کی رکاوٹ پیدا ہو جائے، یہ نظم میر کے رنگ کی ایک انوکھی نظم ہے۔ میر نے کہا تھا:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

یہاں کلیم صاحب کے اشکوں میں بھی شعروں کے درد ڈھلتے ہیں، ان کے ارمان بھی نمناک اور غمناک ہیں، یہاں بھی دکھ درد کے فسانے بنتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ فسانے زبان تک نہ آسکیں بلکہ شاعر کو حیرتی چپن بنا کر رہ جائیں اور اس کی نم آنکھیں سارا فسانہ کہہ دیں، یہ نظم غزل کے ہی قبیل کی ہے۔ کلیم صاحب کا اندرون بھی کبھی کبھی روایتی غزل کے لئے بے چین ہو جاتا ہے، گرچہ وہ اب اس سے بہت دور ہیں، اب وہ اس کو کبھی منہ نہ لگائیں گے، اس لئے کہ ان کے استقلال و استقرار فطرت کا یہی تقاضہ ہے، لیکن اپنے انداز کی غزل کہیں کہیں کہہ گئے ہیں، جو کسی طرح نیم وحشی صنف شاعری نہیں کہی جا سکتی۔

گھنگھور گھٹاؤں کی چھاؤں میں، چمکتی ہوئی بجلیوں کی روشنی میں رنگین بہاروں سے کھیلنے والے کلیم صاحب کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں وہ بھی زلفوں کی شکن میں بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کسی کی بیباک نگاہیں اپنی تیغ حیا سے، ایک نئی طرز جفا ایجاد کر کے انہیں غرض وفا سے روک دیتی ہیں۔ اس پر انہیں مایوسی اور حرماں نصیبی کا ایسا گہرا احساس ہوتا ہے کہ پلکیں بھیگ جاتی ہیں اور وہ خود محو حیرت ہو کر رہ جاتے ہیں، یہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ اضطراب ہجر نہیں تو اور کیا..... اور یہ غزل نہیں تو اور کیا ہے۔

کیوں عشق تڑپتا ہے
ارمان کی آنکھوں میں
آنسو کی تری کیوں ہے
اور دل کی بہاروں میں
رنگوں کی کمی کیوں ہے

(۱۳) ابھی ابھی کلیم صاحب ایک حسین دنیا کا ذکر کر چکے ہیں۔ جہاں کی تکلیف راحت ہے، جہاں کے آنسو آبحیات ہیں اور جس کا خیال ہی ان کی شاعری کو مہمیز کرتا ہے۔ بلکہ انہیں شاعری سکھاتا ہے، ایسی حسین دنیا کو پامال ہوتے ہوئے دیکھ کر وہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں اور وہ حقیقت خواب بن کر انہیں ستاتی ہے، لیکن وہ سنبھل جاتے ہیں اور اس سے ایک طرح کی قلبی حلاوت حاصل کرتے ہیں۔

یہ نظم قدرے طویل ہے۔ ۴۸ مصرعوں پر حاوی ہے۔ اس کے چار حصے ہیں، پہلے تین حصوں میں شاعر نے اپنے گل رعنا کو سراپا طلسم بنا کر پیش کیا ہے۔ مگر یہ طلسم ایسا ہے، جو طلسم ہوتے ہوئے بھی حقیقت کا رازدار ہے، ایسی حقیقت جس کو شاعر نے مادی رنگ میں دیکھا ہے۔ یہ حقیقت ایسی رنگین، سہانی اور کیف آگیں ہے کہ وہ گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے کہ یہ حقیقت خواب ہے کہ افسانہ! اس کی لطافت اس کی صداقت کے لئے بھاری تو نہیں ہوگی؟ اسی لئے اس حقیقت کو وہ طلسم حیرت کہتا ہے۔ اس طلسم حیرت میں وہ شوق برملا دیکھتا ہے اور جور ناسزا پر بھی وعدہ وفا دیکھ کر درد کی دوا پا لیتا ہے اور یہی دوا اس التفات بے پایاں کی بدولت درد لادوا بن جاتی ہے، وہ برابر اپنے متخیلہ سے کام لے رہا ہے، اپنی لغزشوں پر نادم ہے۔ وہ اپنی حسین دنیا کی ایک ایک حسین چیز کی یاد کر رہا ہے۔ اور ہمیں بھی اس کی یاد دلا رہا ہے، وہ حقیقت کے عالم میں ہے۔ لیکن ماضی جو خواب ہو چکا ہے، اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ دوران خون اتنا تیز ہے کہ ایک طرح کا جنون پیدا کر رہا ہے۔ وہ ایسی باتیں، راز کی باتیں بتا رہا ہے، جس کا محرم وہی ہے اور صرف وہی۔ آج اس کی ساری حسرتیں، تمنائیں، آرزوئیں، ولولے، امیدیں، امنگیں، بجلیاں بن کر سامنے کوند کوند جا رہی ہیں، وہ گل رعنا، وہ نور کا

شعلہ سامنے آتا ہے، اس طرح کہ شعلۂ طور بھی اس کو دیکھ کر اپنی لن ترانیاں بھول جاتا ہے (یہاں پر ڈینگ کا لفظ لطافت پر گراں ہے) یہ سماں دیکھتے ہی اس کے لب پر پیار تھرتھرانے لگتے ہیں (یہ انداز حقیقت کے رنگ اور احساس کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے) ۔ مگر فطرت کو انجام معلوم ہے اور وہ حقیقت سے خبردار ہے۔ یہ خیال آتے ہی نظامِ شمسی پر اس کا اثر پڑ جاتا ہے۔ وہ درہم برہم ہونے لگتے ہیں، اس گل رعنا کو دیکھ کر چاند سورج تارے سب شرما جاتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں اور اپنا اپنا مرکز چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ان سے روشنی کے عوض تاریکیاں چھن چھن کر آنے لگتی ہیں۔ ہر چہار طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس گھن گرج میں وہ طلسم نور افشاں ٹوٹ جاتا ہے اور غم کا احساس ساری فضا پر چھا جاتا ہے۔ زمین سے آسمان تک ہر شئے اداس اداس نظر آنے لگتی ہے۔ اس لئے کہ اب وہ گل رعنا ایک استخوانِ سیمیں ہے اور کچھ نہیں اس حصہ میں شاعر نے ابتدائی حقیقت کو انتہائی صداقت کے ساتھ ٹکرا دیا ہے اور اس ٹکراؤ نے درمیان آنے والی ہر چیز کو چور چور کر دیا ہے۔ دنیا کا یہی دستور رہا ہے کہ ایک نقش مٹتا ہے، دوسرا نقش بنتا ہے۔

آہ! وہ گلِ رعنا
استخوانِ سیمیں ہے
اور استخوان اپنے
رنگ و بو کے پانسوں سے
شعبدہ دکھاتا ہے
نقشِ نو بناتا ہے

یہ ایک مکمل نظم ہے، اس میں نظم کی تکنیک نمایاں طور پر برتی گئی ہے پہلا حصہ تمہید کا ہے۔ جس میں شاعر نے فطرت کی مدد سے خیالات اُبھارنے کی کوشش کی ہے، مناظر فطرت کا ہلکا بیان تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ آنے والی افسردگی کا اثر کچھ کم ہو سکے، اس میں ایک استعارہ ایسا استعمال ہوا ہے جو کلیم صاحب کی اپنی ایجاد ہے:

اور اُوس کھا کھا کر
کلیاں مسکراتی ہیں

تمہید اور ابتدا کے بعد وسطی حصہ آتا ہے۔ جذبات پھیلنے لگتے ہیں اور شاعر بے بس ہو جاتا ہے، وہ کچھ راز کی باتیں بتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ گل رعنا اپنی لطافت و رعنائی ہر سو بکھیر دیتا ہے، عروج اس کا ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہے اور عروج کو دیر تک رکھا نہ گیا ہے۔ تاکہ مجموعی اثر کم نہ ہونے پائے مگر دل میں ہلکی ہلکی چبھن سی محسوس ہوتی رہے ــــ اور پھر فطرت کا نظام سے سمجھوتہ کر لینے پر بھی دل میں ایک حلاوت آمیز درد باقی رہ جاتا ہے۔

یہ مری حسین دنیا
خواب ہے کہ افسانہ

(۱۴) تیرھویں نظم کے بعد یہ نظم برمحل ہے، شاعر کا رنگین محل مسمار ہو گیا اور وہ گل رعنا استخوانِ سیمیں میں تبدیل ہو گیا، اس استخوان سیمیں کو دیکھ کر شاعر دنیا کی ثبات و بے ثباتی کی بابت سوچنے لگتا ہے، اسے دیکھ کر وہ اپنے اردگرد فنا بکھری ہوئی پاتا ہے، اس کی حقیقت رسی اس فنا میں بقا کی ضمانت فراہم کر دیتی ہے۔ اس طرح پچھلی نظم نے جو جنون پیدا کیا تھا، ان ۳۴ مصرعوں نے

اس کا علاج کر دیا، یہی استخواں ہے، جو رہ جانے والا ہے، دوسری ساری اشیا فانی ہیں، بود آدم، نمود شبنم ہے، کائنات کا ہر ذرہ فانی ہے، حسن فانی حسن کا جادو فانی، بڑے بڑے سلاطین آئے اور فنا ہوئے:

کوئی لیتا بھی اب نہیں ہے نام
کون سی گور میں گیا بہرام
بس اگر باقی ہے تو یہی استخواں
خاک میں رشک آسماں سے ملی
ہائے کیسی بلند ایوانی
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

میر کا قطعہ جس کا آخری مصرع ہے

"میں بھی کبھو کسو کا سر پُرغرور تھا"

کلیم صاحب پر بہرنوع اثر انداز ہے، یہ نظم 'زہر عشق' کے ان بیانات سے بھی متاثر ہے، جہاں شوق نے فنا کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں غالب کا انداز فکر، میر کی مایوسی اور شوق کی عبرت سرائی سے اس طرح گھل مل گیا ہے کہ فنا کے احساس کے باوجود زندگی زندہ رہنے کے لائق معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس نظم کو ہم میر کے قطعہ کا تتمہ و تکملہ کہہ لیں، تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ میر نے جو ایک طرفہ نقشہ پیش کر کے انقباضی کیفیت ساری فضا میں بکھیر دی تھی۔ کلیم صاحب نے اس گھٹے گھٹے ماحول میں زندگی

کا سانس لینے کی ہمت دلائی اور ایک افسردہ زندگی کو بھی لائق زیست بنا دیا۔ فنا اور بقا کا مسئلہ بڑا نازک ہے، لیکن دونوں کا رشتہ استوار ہے۔ انھوں نے ان کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے چند ایک ایسے اشارے بھی کئے ہیں جن میں دونوں کے باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

کاسۂ سر کی زبانی رازہائے حیات و ممات بتا کر کلیم صاحب نے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی ایک شگفتہ تفسیر پیش کی ہے۔ کاسۂ سر کا یہ کہنا

لب کوثر کہاں ہے جم غفیر
راکھ کا ایک ڈھیر نا رسیر

درحقیقت ایک عقدۂ مشکل کی گرہ کشائی ہے، یہ خود صوفی تو نہیں مگر صوفیانہ خیالات کے حامل ہیں اور کون جانتا ہے کہ کس روز ان کی صوفیت کا ثبوت بھی فراہم ہو جائے۔

یہ نظم بھی علامتی انداز لئے ہوئے ہے، مادہ اور روح کا تعلق اور پھر ان کی انفرادی حیثیت پر اس سے اچھی روشنی پڑتی ہے، اگر روح امر ربی ہے تو قطعاً لافانی ہے۔ حوریں، جنت، دوزخ، کوثر یہ سب تو مخلوق ہی ہیں پھر ان پر بھی فنا کا طاری ہونا ضرور ہے۔ اس لئے شاعر ان سب موجودات کو فانی بتا کر یہ کہدیتا ہے۔

میں ہی اول ہوں، میں ہی آخر ہوں
استخواں باقی، استخواں باقی

استخواں سے استعارہ روح کا ہے، شاعر نے یہ استعارہ اس لئے منتخب کیا یا وضع کیا کہ اس نے اپنے محبوب کو استخوانِ سیمیں بتایا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا

۷۸۶

عذرِ جسارت

کلیم الدین احمد کے تنقیدی کارناموں سے ہر ادب نواز واقف ہے۔ اب وہ ہمارے سامنے شاعر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ ان کے دو مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ میں نے اپنے نقطۂ نگاہ سے ان کی شاعری کو جانچنے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر مجھے اس کا اعتراف ہے کہ بعض باتیں ابھی تک میرے پلّے نہیں پڑ سکیں۔ ان کی نظموں کو بھی اچھی طرح وہی شخص سمجھ سکتا ہے، جو انگریزی ادب کا ماہر ہو اور فارسی و عربی کے ساتھ ساتھ جس کی نظر فرانسیسی جرمن اور روسی ادب پر بھی گہری ہو۔ ایسی صورت میں مجھ جیسے بے بضاعت انسان کے لئے ایسے شاعر کا مطالعہ ایک جسارت اور جراءت ہی کا کام ہے اور میں اعترافِ شکست کے ساتھ یہ حقیر مطالعہ پیش کر رہا ہوں، میری واقفیت انگریزی ادب سے کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، فرانسیسی، جرمن اور روسی ادب کا تو ذکر ہی کیا۔

'۴۲ نظمیں' پر کچھ تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن '۲۵ نظمیں' پر ابھی تک اربابِ میکدہ نے توجہ نہیں کی۔ میں نے دونوں مجموعوں پر تبصرے لکھے ہیں۔ لیکن بعض نامساعد حالات کے تحت بسردست صرف ایک مجموعہ شائع کر رہا ہوں۔ ۲۵ نظمیں کا مطالعہ۔ ان شاء اللہ جلد ہی منظرِ عام پر آجائیگا۔ مجموعہ اول الذکر کے ناقدوں میں کسی نے ان اشعار کو سراہا اور کسی نے ہر طرح کے کیڑے ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ ملا جلا ردِ عمل تو فطری ہے۔ طبیعتیں مختلف ہیں اور ادب میں ہر شخص اپنے مذاق کی تسکین چاہتا ہے۔ جنہوں نے عیب نکالنے کی کوشش کی ہے، ان سے یہی کہنا ہے کہ کلیم الدین احمد کی جتنی کتابیں منظرِ عام پر آئیں، ابتدا میں ان کی ہر کتاب کو بری نظر سے دیکھا گیا اور رفتہ رفتہ یہی برائیاں لوگوں کی نگاہ میں بڑائیاں بننے لگیں۔ یہ بھی قدرت کا ایک تازیانۂ عبرت ہے۔

محبوب غیر فانی بن جائے تاکہ وہ اپنی آئندہ مساعی میں، اسی استخواں کو اپنا خضرِ راہ بنا سکے اس لئے کہ:

بود آدم نمودِ شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

جوش کی نظم 'غمگین صدا' بھی اسی قطعہ سے متاثر ہے۔ مگر جوش محدود دائرہ میں گھومتے ہیں، ان کے تجربوں میں خلوص کے عوض تصنّع کی کارفرمائی ہے۔

آرہی ہے یہ تربتوں سے صدا — پھول راس آئے تم کو خوش رہنا
چرخِ ہستی پہ تھے ستارے سے — ہم بھی تھے ایک دن تمہارے سے

کلیم صاحب نے ایسا انداز اختیار کیا ہے، جو نہ صرف نیا ہے، بلکہ اس کا دائرۂ اثر بہت وسیع ہے۔

اب اگر اقبال کی نظم 'سیرِ فلک' کے ان اشعار کو پڑھئے، تو سارا عقدہ حل ہو جاتا ہے:۔

کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے — خاتمِ آرزوئے دیدۂ گوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر — کرۂ زمہریر ہو روپوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی — حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقامِ خنک جہنم ہے — نار بھی نور سے تھی ہم آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اس کے — جس سے لرزاں ہے مردِ عبرت کوش
اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں — اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

(۱۵) شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے، مگر محرمِ راز کوئی نہیں۔ اس کے دل میں جو سوز و شورش ہے، اس سے وہ پریشان ہے۔ چاہتا ہے کوئی ایسا ملے، جس سے اپنے دل

کی باتیں کہہ کر بوجھ ہلکا کرے۔ کچھ تڑپے اور کچھ تڑپائے کہ تڑپنے سے کچھ تسکین سی آجاتی ہے۔

غالب نے اپنے ماحول کی نارسی کا شکوہ اس طرح کیا ہے

'میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں'

مگر شکوہ ہی پر وہ اکتفا نہ کر گئے۔ انھوں نے باتیں کہیں، کام کی باتیں کہیں اور اپنے زمانہ کے لوگوں کی غیرت کو للکارا:

بیا ور ید گر اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

اقبال کو بھی اپنے پیام کے پہنچانے کے لئے ایک ہمنوا کی تلاش تھی۔ ان کو بھی گوش شنوا رکھنے والے رازداں کی ضرورت تھی

من بصحرا چوں جرس گرم خروش

لوگ ان سے تقاضائے حدیث دلبری کرتے رہے۔ مگر ان کا یہ حال تھا:

من بہ آغوش صدف تابم ہنوز
در ضمیر بحر نایابم ہنوز

کلیم صاحب بھی اس دنیا میں تنہا ہیں۔ ان کا دکھ درد بانٹنے والا کوئی نہیں وہ گلشن میں جاتے ہیں، بہاروں سے کہتے ہیں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ وہ آسمان پر چاند ستاروں کو اپنا ہمنوا بنانا چاہتے ہیں۔ مگر وہاں بھی کوئی غمخوار نہیں۔ اگر شاعر ایک معمولی انسان ہوتا، تو اس تنہائی اور ویرانی سے گھبرا جاتا مگر نہیں؛ اس کو اس ویرانی سے اور بھی محبّت ہو گئی ہے۔ جیسے جیسے اس کو تنہائی کا احساس شدید ہوتا گیا، ویسے ویسے اس کی ویرانی سے محبت بڑھتی گئی۔ باغ میں کوئی ہمراز

نہ ملا، صحرا نوردی بھی بیکار گئی، چاند ستاروں سے بے فائدہ درماں طلبی کی۔ اب شاعر انسانوں کی دُنیا میں آتا ہے۔ یہاں بھی اس کی طرف ملتفت ہونے والا کوئی نہیں، وہ کہہ اٹھتا ہے:

میں بزم میں جاتا ہوں
دُکھ، درد سناتا ہوں
پر حُسن کو نخوت ہے
اور عشق ہے دیوانہ
آنکھیں ہیں تو نابینا
دانائی ہے نادانی
خلوت ہو کہ جلوت ہو
سنتا نہ سمجھتا ہے
کوئی مرا افسانہ

کلیم صاحب اقبال سے زندگی کے ہر موڑ پر متاثر نظر آتے ہیں۔ مگر اقبال کا پیغام ادب اور شعر پر کبھی کبھی ایسا حاوی ہو گیا کہ شاعری کی روح نکل گئی ان کا پیغام الفاظ کی تہوں میں، استعارات کے پردوں میں، پھولوں کی خوشبو میں، اور پنکھڑیوں کی اوٹ میں، سورج کی کرنوں میں، چاند تاروں کی چھاؤں میں، بیابانوں میں ریگزاروں میں، دن کی روشنیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں کچھ اس طرح گھُل مِل گیا ہے کہ صرف دیدۂ بینا دیکھے اور دماغ رسا سمجھے۔ یہاں شاعر ملک و ملّت کی زبوں حالی پر نالاں ہے۔ وہ علامتی زبان میں آڑے ترچھے نشانات بناتا چلا گیا ہے۔ اس نظم کی یہی خوبی ہے کہ رومانی لہروں سے کھیلتی ہوئی اصلاحی فرض

نباہ رہی ہے :

صحرائے دل و جاں میں
تاریک ہے سناٹا
اِک شہر خموشاں ہے
یہ روح کا ویرانہ
پھر کیوں یہ خلش دل کو
دن رات ستاتی ہے

یہ ترپن ۵۳ مصرعے شاعری کے معیار پر ہر طرح اُترتے ہیں۔ مگر گہری نظر ڈالی جائے تو یہ کسی سوزِ نہاں کے غماز ہیں۔ جن کا چھپا چھپا بیان کامیابیوں کا نشان بن گیا ہے۔ شاعر کو ایک رفیق کی ضرورت ہے، ایسا رفیق جو زندگی کی ہر منزل پر اس کا ساتھ دے سکے۔

(۱۶) ۴۳ مصرعوں کی یہ نظم بھی اس سے پہلے والی نظم کی طرح اندرونی کرب اور داخلی اضطراب کی غماز ہے، شاعر اپنے حال سے مطمئن نہیں، حال سے نا آسودگی مستقبل کو افسردہ انجام بنا سکتی ہے۔ مگر شاعر مستقبل کا ذکر نہیں چھیڑتا، وہ اس کا یقین رکھتا ہے کہ حال افسردہ ہو تو ہو وہ مستقبل کو المناک نہ ہونے دیگا اس نظم میں وہ عندلیب گلشن ناآفریدہ نہیں رہتا، اس نے ہمنوا بنا لیا ہے۔ ہم سخن پا لیا ہے۔ اب اپنے ہمراز کو وہ دردِ دل کہتا ہے، وہ شکوہ کرتا ہے کہ قفس نشیمن میں اس کے طائرِ جاں نے آشیاں بنایا ہے۔ یہاں تو صدہا مار آستین ہیں۔ قدم قدم پر بغض و عناد ہے۔ بات بات پر دنگا فساد ہے، گرچہ حق تو یہ ہے :

اس مرے نشیمن میں
اس حسین گلشن میں
ٹھنڈے ٹھنڈے سائے ہیں
پھولوں کے نظارے ہیں
جو زمیں کے تارے ہیں
چشمے گیت گاتے ہیں
آئینے بناتے ہیں

اس آراستگی و درستگی کے باوصف اس گلشن کو، اس لطافت کے مخزن کو حشرات الارض نے رہنے کے لائق نہ رکھا۔

اس نظم کی ابتدا میں شاعر مناظر فطرت کے بیان سے اثرات کو اور بھی گہرا کرنا چاہتا ہے، تمہید میں فطرت کی زرنگاری اور قدرت کی فیاضی کا ذکر کر کے اپنے گلشن میں اس درد دل کے گلشن کی ساری خوبیوں اور کشتوں کو واضح کر دینا چاہتا ہے، تاکہ خیر اور شر کا تصادم صاف معلوم ہو جائے۔ ایسی زرنگار سرزمین، ایسے فطری حسن لکھتے ہوئے چمن کو ایسے حیوانوں نے آباد کیا ہے۔ جن سے طائر جاں عاجز آ گیا ہے اور خاک و خوں میں تڑپتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا حسین ماحول اور ایسے قبیح انسان، یہ ہے (ANTI THESIS)۔

کس کے تیز تیروں کا
آج یہ نشانہ ہے
درد سے تڑپتا ہے
خاک و خوں میں غلطاں ہے

یہ نظم بھی علامتی بنیاد پر قائم ہے، علامتیں ایسی گہری ہیں اور تہہ دار کہ شاعری کا لطف کسی حال میں کم نہیں ہوتا، انسان کی روح قفسِ جسم میں بند ہے جہاں اس کے ارتقار کے سارے امکانات ہوتے ہوئے بھی وہ ان امکانات کو فروغ دینے میں ہر سمت سے اختلافات کا سامنا کرتا رہتا ہے :-

آہ! اِس نشیمن میں
مار آستیں کیسے
کیسے دشمنِ جاں ہیں

ایک پیغام رساں شاعر کی طرح کلیم صاحب پیغام رسانی کے ہر ابتدائی تقاضا کو پورا کر رہے ہیں آدمی کو اس کے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا، اس وجود نابودی کی شان بتائی، فنا اور بقا کے راز سکھائے۔ اپنے پیغام کے سننے والوں کو پیغام سننے کے لائق بنایا۔ اس سرزمین کی خوبیوں کو بیان کرکے اس سے محبّت کرنا بتایا تاکہ اب وہ جو کہیں، جس کے لئے کہیں وہ سمجھے اور اس پر عمل کرے :

بیا دریدہ گرا اینجا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

جس طرح اقبال ہمنوا اور رازداں کی جستجو میں کامیاب ہوئے :

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اسی طرح کلیم الدین احمد کو بھی ہم سخن اور ہمنوا مل گیا :

اِس حسیں نشیمن میں
درد دل کے گلشن میں

میرے طائرِ جاں نے
ہم سخن بنائے ہیں
ہمنوا بنائے ہیں
پیار انھیں سکھائے ہیں

(۱۷) یہ نظم پچھلی نظم کا ایک سلسلہ ہے۔ شاعر اس عالمِ کثرت میں اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے، چاروں سمت روشنیاں بکھری ہوئی ہیں۔ تمدّن و تہذیب کے قمقمے روشن ہیں۔ حیات پرور مناظر ہیں اور جسم پرور مظاہر، پھر بھی ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، دلوں پر موت طاری ہے، روح نالاں ہے۔ ہر طرف کی امید ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی ہے۔ اس لئے وہ انھی مایوسیوں سے امید کی روح لے کر اپنے رگ و پے میں جاری کرنا چاہتا ہے، وہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کے طائرِ جاں کو ہم سخن مل گیا ہے، وہ اپنے الفاظ، اپنے سخن، اپنے اشعار کو سارے ماحول پر چھا جانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اپنی فکرِ بلند کو نقطوں کی کرنوں سے اور بھی رخشاں دیکھنا چاہتا ہے۔ اب تو سخن ہی سے مدد طلبی ہے اور دادرسی کی امید۔

سخن کی تعریف، بعض شعرا نے بڑے ہی فکر انگیز انداز میں کی ہے، وجہی غواصی، جوہری، میر اور راسخ نے جو کہا ہے، اس نظم میں اس کا نچوڑ ہے۔ اس کی تعبیر ہے، شاعر کے شعور اور تحت شعور پر وہ سارے خیالات مرتسم ہیں اس نے ان نادر خیالات کو مرتب و منظم کر کے ایک ایسا گلدستۂ سخن بنایا ہے، کہ اس میں ایک حلاوت اور پائیداری آ گئی۔ ۲۰ مصرعے امید و مسرت کے ترجمان بن گئے۔

مرہم زخم کائنات ہو تم
اول و آخر حیات ہو تم

اللہ تعالیٰ اگر کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے، تو لفظ 'کُن' کہتا ہے 'فیکون' پھر وہ چیز عالم وجود میں آجاتی ہے۔ سب سے پہلے اس ذات قدیم نے قلم بنایا اور قلم کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے 'کُن' لکھا، ساری حیات وجود میں آگئی۔

نہ اپنے آپ سے کوئی سناتا
سخن از مبدأ فیاض آتا (جوہری)

چمکو چمکو فضا میں اے لفظو!
میری دنیا کو جگمگا جاؤ
نور کی ندیاں بہا جاؤ
تم سے روشن فلک پہ ہیں تارے
کہکشاں، سورج اور سیارے
پھولوں میں یہ مہک تمہاری ہے
بلبلوں میں چہک تمہاری ہے
ابر رحمت ہو، آب حیواں ہو
تم سے سیراب کیوں نہ انساں ہو

(۱۸) اس نظم کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ دوسرے کا متضاد ہے پہلا حصہ خیر کا اثر ہے، تو دوسرا شر کا اظہار، شاعر عجب حیرانی کے عالم میں ہے۔ اس کے دل میں جو امید کے چراغ جلے تھے، وہ باد مخالف سے گل ہو گئے، وہ خوش تو ہوا یہ دیکھ کر کہ یہ زمین بقعۂ نور بنی ہوئی ہے، ہر سمت رخشندگی و درخشندگی ہے۔ اس کے دل کا مندر ہر طرح سے سجا ہوا ہے۔ حسن کی دیوی اس کے پاس ہے۔ وہ اس

کی ادا اور حیا سے اپنی رگ رگ میں ایک تازہ خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا ہے۔
جس عشق کی تلاش تھی، جس پر انسانیت کی بنیاد تھی، جس پر الوہیت کو ناز تھا،
وہ عشق بھی خندہ و فا اور شیوۂ تسلیم و رضا کے ساتھ اپنی آرزوؤں کی مالا لے کر
حسن کی سرکار میں جاتا ہے اور اپنے دل کی بیکلی ظاہر کرنے کے لئے اس کو یارائے سخن
بھی نصیب ہو گیا ہے۔ اب دنیا رحمت کا بسیرا ہونے والی ہے۔ مگر شاعر اپنے اس
خیال سے فوراً ہی باز آجاتا ہے، کچھ تلخ حقائق اس کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں اور
ساری حقیقتیں خواب بن کر سامنے بکھرنے لگتی ہیں، دیو فساد اپنی ڈراؤنی
شکل، اپنے ڈراؤنے غار جیسے گہرے جبڑے کھول کر دکھانے لگتا ہے،
یہیں پر آکر نظم ختم کر دی جاتی ہے۔ دو متضاد رجحانات کا تصادم دکھلا کر
ہر دل میں سوچنے سمجھنے کے لئے مواد فراہم ہو جاتا ہے۔

ہر صبح اُمنگوں، امیدوں
ہر شام خیالوں، ارمانوں
کو کچلا روندا جاتا ہے
کیا خون کے چشمے بہتے ہیں
یوں حسن کی پوجا ہوتی ہے

۴۰ مصرعوں کی یہ نظم تہہ دار ہے اور حامل سرِ نہاں۔ اپنی اپنی فہم کے مطابق
جو چاہئے سمجھئے۔ شاعر بہرحال اپنی شخصیت کو علیحدہ رکھتا ہے۔ یہی اس کا
فن ہے اور یہی اس کا کمال۔

ٹوٹی سی دیکھو عمارت ہے
کیسی ہیں شکستہ دیواریں

کیسی یہ بھیانک صورت ہے
یہ روئے سیہ، خوں ریز نگہ
یہ طبل و علم، شمشیر و سناں
زنجیر و سلاسل، طوق گراں
یہ ظلم و تشدد کے ہیں علم
یہ قہر کی دیوی کا ہے نشاں

(۱۹) اُمید و نا امیدی سے برسرِ پیکار شاعر کامیاب ہوتا ہے، نا امیدی مات کھا جاتی ہے، امید اپنے بال و پر نکھارتی ہے۔ عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی جاری ہوتا ہے۔ اب تاریکی کا دور ختم ہوا۔ فطرت نے ان حسین نشانیوں کو قبول کر لیا۔ اس نے محبت کے گلہائے رنگا رنگ کھلائے۔ شاخیں مست ہیں، ہوائیں مست ہیں، سبزوں میں مہک ہے، شبنم میں چمک ہے، اور شاعر کے دل میں سکوت کروٹ لے رہا ہے۔ آخری ٹکڑے میں ایک طرح کی خود کلامی - SOLI-LOQUY میں شاعر محو ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کلیم صاحب نے جو رنگ و بو کی دنیا پائی تھی اور جس طرح ان کی حیات کا ہر لمحہ کیف پرور تھا وہ ان کے بھلائے نہیں بھولتا، رہ رہ کے ان کے دل میں ایک کچوکے سا لگتا ہے، کسی کی یاد رہ رہ کر آتی ہے اور ان کو بیکل کر دیتی ہے:-

"اب میں کہاں سے لاؤں اس پھول کا تبسم"

یہی انداز ہے، جو کلیم صاحب کو دوسرے پیغام گو شعرا سے ممتاز بنا دیتا ہے بلکہ پائیدار بنا دیتا ہے۔ حسن و عشق کے یہ جذبے جو امر ہیں، ان کی شاعری کو بھی امر بنا گئے اور ان کے پیغام کو بھی امر بنا گئے، یہ اشعار ان کی نظم شاعر کی

بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد، جو لکھتے ہیں، وہ اردو ادب میں وقت سے پہلے، بہت پہلے یہ حال کے اسیر نہیں ہوتے۔ ہمارے ادبا رجن کی نگاہ حال ہی کے جال میں پھنس کے رہ جاتی ہے۔ جو مستقبل کو صرف ایک زاویہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان ادب پاروں سے مستفید ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ بعض اپنی مرگ مفاجات کو سہنے کے لئے تیار ہونے کے بجائے دوسروں کو مار دینے کی فکر کرنے لگتے ہیں۔ مگر جس ادب کو زندہ رہنا ہے، وہ زندہ رہے گا:

اس کو سمجھے گا ہوش والا
اس کو دیکھے گا آنکھ والا
اس کو پائے گا عقل والا

انگریزی کا یہ فقرہ کہ طرز نگارش ہی شخصیت کی غماز ہے۔ کلیم الدین احمد کی شاعری پر ہر اعتبار سے صادق آتا ہے۔ جس کسی نے ان کو دیکھا ہے، اور ان کو پڑھا ہے۔ وہ اچھی طرح جان لیتا ہے کہ یہ سادہ انسان، خاموش انسان اور بہت معمولی انسان اپنے دل میں کیسا وقار، کیسی دبازت اور کیتے نغمے پنہاں رکھتا ہے۔

امید ہے کہ وہ حضرات جنھیں ذوقِ سلیم کی نعمت ملی ہوئی ہے، وہ رفتہ رفتہ ان نظموں کی طرف ملتفت ہوں گے اور ادب کو نئے افق سے روشناس کرائیں گے۔ میں نے جو عرض کیا ہے، وہ حقیقت کا بیان ہے۔ کسی کا جذبہ مجروح کرنا مقصود نہیں اور میں اپنی بے باکی کے لئے عذر خواہ ہوں۔

وَالعُذرُ عِندَ کِرامِ النّاسِ مَقبُول

صدرالدین

۱۳ر جنوری ۱۹۶۷ء

رنگین دلی اور شگفتہ دلی کے راز بتا رہی ہے :-

وہ نیم باز آنکھیں، وہ دل رُبا تبسّم
وہ رنگ کا تموّج، نکہت کا وہ تلاطم
اس نے ضرور کوئی دلچسپ خواب دیکھا
حسن اپنا باغ عالم میں انتخاب دیکھا
اب میں کہاں سے لاؤں۔ اس پھول کا تبسّم

(۲۰) شاعر کا دل جس کے لئے مضطرب تھا، وہ سخن پہلی بار اس کی زبان پر آتا ہے اور ذرا تیکھا انداز لئے ہوئے۔ لیکن اس تیکھا پن میں بھی ایسی کشش ہے کہ ہر حسّاس دل تھوڑی دیر کے لئے اپنے ارد گرد نظر ڈالنے پر مجبور ہو جائے۔ کلیم صاحب کی انسان دوستی اور انسانیت کی پکار نے ان کو برابر یہی سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ یہ دنیا اپنی ساری رعنائیوں کے باوجود بھروپیوں کی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ جہاں دن رات رنگ و بو کی پریاں اور نور کے فرشتے سوانگ بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی رنگ بھی ان کا اپنا رنگ نہیں۔ اس لئے ان کے کسی رنگ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ حیات کے ان سیمیں پردوں پر جتنے بھی نقوش بنائے جاتے ہیں، وہ سین بدلتے ہی مٹ جاتے ہیں۔ گل، خار میں بدل جاتا ہے۔ موتی کنکر بن جاتا ہے۔ جفا، وفا کی جگہ لے لیتی ہے، اور پھر یہ انسان درندے بن کر تباہی لاتے رہتے ہیں، پھر وہی انسان اور فرشتے بن کر بار دگر سوانگ رچنے کی ضرورت یاد دلاتے رہتے ہیں۔

اور یہ درندے پھر
اس رباط زرّیں کے

پردہائے سیمیں پر
پریوں اور فرشتوں کا
روپ دھار لیتے ہیں

اور اب شعر و شاعری کی کہاں گنجائش، غزلیں چپ لگاتی ہیں اور انسان اپنی ابدی اقدار کی حفاظت میں لگ جاتا ہے۔ مجبور انسان پھر اس کا سہارا پکڑتا ہے اور پھر وہی چکر چلتا ہے اور وہ شوخ و شنگ تصویریں جنھیں صانع حقیقت نے اپنے دست قدرت سے بنایا اور سجایا تھا، یونہی قہر و جبر کے فولادی پنجوں میں جکڑ کر ٹوٹ پھوٹ جاتیں۔ مجبوری ہر قہر و تشدد کو آیۂ رحمت بنا دیتی ہے اور وہ اسی آیۂ رحمت کی پناہ میں اپنی بے بسی کے دن کاٹتا رہتا ہے۔

یہ حسین تصویریں
نور کے فرشتے ہیں
رنگ و بو کی پریاں ہیں
ان کی بھولی آنکھوں میں
دلبری و رعنائی
ان کی نیچی نظروں میں
شرم اور سیحائی
اور جو فرشتے ہیں
وہ وفا کے پتلے ہیں
ان کا بس یہ شیوہ ہے

۴۶

عاشقی و جانبازی
جانکنی و رُسوائی
اور ان کی نظروں میں
رحم اور رحمت ہے

شاعر کا متخیّلہ زمین، آسمان اور ساری فضاؤں پر محیط ہے۔ سارے مناظر قدرت انسان کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اس کا اسے احساس ہے مگر وہ حیران ہے کہ انسان ہی انسان نہ رہا اور جب مخدوم ہی بدلا، تو خادموں نے بھی چولا بدلا، اب تو رحم و رحمت کی جگہ قہر و غضب ہر سو محیط ہے۔ انسان اور فرشتے سب کے سب خیر کے شکاری، حسن کے شکاری اور حق کے شکاری بن گئے ہیں..... اپنی اپنی شقاوت میں مست ہیں اور معصوم انسانن کو اپنے فریبہائے بے پایاں میں روز بروز مقید ہی کرتے جا رہے ہیں، یہ درندے پھر ہیکڑی جتاتے ہیں اور غریب انسان کو چیر پھاڑ کھاتے ہیں، خون چوس لیتے ہیں۔

دوسری نظموں کی طرح یہ بھی علاماتی نیور سے مملو ہے، اس میں ۶۵ مصرعے ہیں اس لئے قدرے دیر تک یہ علامتی انداز برقرار رکھنے میں کچھ کوتاہی ہو گئی ہے، آخر کے ٹکڑے صاف شاعر کے غم و غصّہ، نفرت و حقارت ظاہر کر رہے ہیں۔ جن سے نظم کی تہہ داری کچھ یکسو ہو کر رہ گئی ہے۔ الفاظ بڑے نرم اور سادہ ہیں اور جذبات سے اس طرح معمور ہیں کہ دل میں تیر کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔ بعض محاورے بڑے برجستہ آ گئے ہیں۔ پوری نظم بیانیہ انداز لئے ہوئے ہے۔ واضح، سادہ اور دلکش، ترنم اور روانی پھوٹی پڑتی ہے۔ تکرار الفاظ بلکہ تکرار خیال سے ایک

پُرکیف سماں بندھ جاتا ہے ۔ وہ حسن کے شکاری ہیں وہ خیر کے شکاری ہیں یہ ٹکڑے اپنی اہمیت اور معنویت کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیتے ہیں ۔

(۲۱) دنیا ہے میری کتنی سُہانی
یہ رنگ و بُو سے کیسی سجی ہے
یہ لالہ و گُل ، یہ سرو و سُنبل
کیسے ہیں ان کے رنگیں نظارے

۳۹ مصرعوں کا یہ مختصر سا معراج نامہ ہے ۔ جس کی ابتدا ان چار مصرعوں سے ہوتی ہے ۔ شاعر کی دنیا رنگ و بُو کا چمن ہے ، یہ ایک کیف پرور سکون آگیں مقام ہے ۔ جہاں اس کی دل بستگی کے سارے سامان موجود ہیں ۔ تاروں کی شمعوں نے محفل سجا رکھی ہے ، لالہ و گل ، سرو و سُنبل روش روش پر نور دیدہ بن کر پھیل گئے ہیں ، ساری فضا میں مسرت کی شہنائیاں بج رہی ہیں ، مستی اور پیش دستی کے نظارے ماحول میں گھل گئے ہیں ۔ مگر اس کا دل ویران ہے ، اسے اس معمورہ میں ، اس رنگ و بُو کی بستی میں ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے ۔ وہ اُوپری مسرتوں سے اپنے دل کی لگن بھولنے والا نہیں ، اس کا دل دُکھی ہے ۔ وہ بند غم اور قید اجل سے بدظن ہے ، اسے کوئی ہمنوا چاہیئے ، کوئی چوٹ کھایا ہوا دل چاہیئے ، وہ ایک فریادرس کی تلاش میں ہے ، اسے ایک ہمراز کی جستجو ہے ، وہ اپنا ہم سخن اور ہمخیال کھوجتا ہے ۔ وہ عندلیب گلشنِ نا آفریدہ نہیں بننا چاہتا ہے ، مگر وہ آسمان پر ، میں ہوں زمین پر ۔ اب اس کی بیماری دور کس طرح ہو ، زمین والے اہل نہیں ، آسمان والے اس کے اہل نہیں ، وہ تو دور دیس کے باشی ہیں ۔ زمین والوں کے دکھ درد کو کیا جانیں ، گھائل کی گت گھائل جانے ، شاعر انتہائی یاس

ہیں ادھر ادھر تاکتا ہے اور کوئی نوید جانفزا سننے کا منتظر ہے۔ مناظر قدرت کی اتنی ساری زبانوں کو وہ خاموش دیکھ کر سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ وہ قدرت کی ہر قلموئی کو زبان گویا دینا چاہتا ہے۔ اسی انتظار میں شبنم کی بوندیں گرتی ہیں، وہ ان سے درس پرواز سیکھنا چاہتا ہے۔ مگر وہ بھی زمین والوں کی دون ہمتی سے متنفر ہیں اور پستی کے داغ کو ان کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ سمجھنے لگی ہیں۔ شبنم کا یہ طنز:۔

چھوڑ اس زمیں کو، دیکھ آسماں کو
یہ چاند تارے، کیسے ہیں پیارے
زرّیں نظارے، زرّیں نظارے
اس بندِ غم سے، قیدِ فنا سے
آزاد بھی ہیں، دل شاد بھی ہیں

شاعر کے دل میں جگہ کر لیتا ہے، وہ اپنی پریشانیوں کا علاج چاہتا ہے، اب وہ اوج فلک پر جاتا ہے، وہاں جاتا ہے، جہاں بال جبریل جل جاتے ہیں، مگر انسان جاتا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ جبریل بھی اس کی بے باکی پر حیران ہے اور شیطان بھی اس کے پر و بال دیکھ کر دم بخود ہے، انسان، انسان ہے۔ نہ فرشتہ ہے اور نہ شیطان، یہ اسی انسان کا رتبہ ہے، وہ فلک پر کیا دیکھتا ہے:۔

جنّت بھی سونی، دوزخ بھی سونی
عرشِ بریں پر اک ہُو کا عالم
اب کیا بتاؤں، کیا میں نے دیکھا
کیوں دل کی بستی سونی پڑی ہے

شکوۂ غالب، حالی اور شکوہ اقبال کے بعد یہ ایک ہندوستانی کا شکوہ عجیب رنگا رنگی رکھتا ہے، شاعر کہنا چاہتا ہے:

"ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

مگر کس شاعرانہ سج دھج سے پیش کش ہوئی ہے، کیسا رومان انگیز اور فکر پرور بیان ہے، جس کی حلاوت سے کام و دہن آشنا ہیں۔ مگر زبان 'من منیں' لٹ پٹاتی رہے۔ انسان کی محرومیوں، سرمایہ داروں کی قہر کاریوں اور سلاطین کی بدکاریوں اور سفاکیوں کو اب انگیز کرنا ہے کہ عرش بریں پر اک ہُو کا عالم ہے۔ اس حسن مجرد نے اس عقل کل نے اپنا کام کر دیا اور اب وہ خاموش ہے بعض فلسفیوں کا یہ خیال ہے کہ واحد محض صرف ایک کام کر چکا اور وہ ہے تخلیق عقل اول، اور اب وہ بیکار ہے۔ اب اس کی تخلیقات ہی کو سالے کام انجام دینے ہیں، اسی طرح سعی عمل پیدا ہوگی اور عمل ہی سے انسانوں نے اپنی بگڑی بنائی ہے۔ سچ ہے کہ دل جلوہ گاہ ایزدی ہے۔ جب دل ہی سونا ہے، تو عرش بریں بھی سونا ہوگا، عرش سونا ہے، اس لئے ہماری ساری محرومیاں اور مجبوریاں نکھر آئی ہیں۔ کوئی ان کے زیب و زینت تو دیکھے:

چاندی کے چشمے کیا بہہ رہے ہیں
جنگل سجے ہیں کیسے سجیلے
کیسے ہیں ان کے رنگیں نظارے

کلیم صاحب بھی خدائے تعالیٰ کے رہنے کی جگہ عرش بریں کو مانتے ہیں، قرآن پاک میں ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی، یہاں پر وہ مشرقی عقائد کو راہ نجات مانتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ ان کی فطرت، ان کی وراثت

اور ان کی درایت کا تقاضا ہے۔

(۲۲) شاعر مشرقی اور ہندوستانی ہونے کی وجہ سے قدرتاً قنوطیت سے دور واقع ہوا ہے، مگر اس کی قنوطیت، رجائیت کی لہروں کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس طرح کے فلسفہ حیات میں وہ ہارڈی سے بہت قریب ہے، مغربی شعراء میں ہارڈی ہی کی ایک ایسی متوازن ہستی ہے، جو قنوطیت اور رجاء کے درمیان ایک سنہرا رشتۂ اتحاد قائم کئے ہوئے ہے، ہارڈی نے انسان کو تقدیر کا کھلونا نہ بنا رہنے دیا۔ اس کی تقدیر کو تدبیر سے ہم آہنگ کیا، اور زندگی کو سراسر کدورت و انقباض سے نجات دلائی، یہ نظم ۹۳ مصرعوں پر مشتمل ہے جس کی ابتدا اقبال کے ذہنی ارتقا کو ہمارے سامنے لے آتی ہے:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا

یہ شکوہ بھی ہے، جواب شکوہ بھی، شاعر نازک دل اور نازک حس رکھتا ہے، وہ ہنگامۂ زمانہ سے گھبرا کر انسانوں کی دنیا سے دور بہت دور آسمانوں کی دنیا میں بسنا چاہتا ہے، وہ اس دنیا کو آدم آباد جانتا تھا مگر اب تو یہ حیوان آباد معلوم ہوتی ہے، اس نظم میں وہ شوخی اور بے باکی ہے، جو انتہائی نزدیکی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ کہنا پڑتا ہے:

"ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے"

ہارڈی کے مجموعہ اشعار میں دو نظمیں ایسی ملتی ہیں، جن کو ہم شکوہ اور جواب شکوہ کا ایک رخ کہہ سکتے ہیں، ایک تو بھولا ہوا خدا (God for gotton) اور دوسری خدا کی تعلیم (God's Education) ہے

پہلی نظم نسبتاً بڑی ہے، بارہ بندوں کی۔ اور دوسری مختصر چار بندوں کی۔ کلیم صاحب نے خیالات کا سرچشمہ اول الذکر نظم سے لیا ہے اور آخر الذکر نظم کا تاثر اپنی نظم کے آخری حصہ میں دکھایا ہے، چونکہ یہ دو نظموں کے خیالات پر حاوی ہے۔ اس لیئے دونوں کی خوبیاں ایک بڑے کینوس پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس طرح اثر میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ ہارڈی کی نظمیں دو تیوہ جدا گانہ تیور پیش کرتی ہیں اس لیئے ان کا اثر نفوذ کن ہے اور ہر تصویر صاف اور واضح ہے، جو نقش جمتا ہے، وہ ایک جہان تصورات سامنے لاتا ہے۔ ممکن ہے کلیم صاحب نے یہ سارے خیالات مشرقی اور ہندوستانی ماحول سے لیئے ہوں۔ اس لیئے کہ انسان فی الواقع دل یزداں سے بھلایا ہوا افسانہ معلوم ہوتا ہے، اس نظم میں ایک جھلک اس نظریہ کی بھی ملتی ہے، جس کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ انسان جس طرح ترقی پذیر ہے، خدا بھی اسی طرح ارتقا کی طرف گامزن ہے۔ اس فلسفہ کو وضاحت کے ساتھ کلیم صاحب نے اپنے دوسرے مجموعہ اشعار کی پانچویں نظم میں بیان کیا ہے:

پہلی نظم کا یہ اسٹینزا پڑھیئے:

"O Lord, forgive me when I say,
Thou spakest the word that made it all"

اور کلیم صاحب کی نظم کے یہ مصرعے دہرایئے:

یہ جی میں آئی کہ پوچھوں خدائے دنیا سے
یہ دنیا تو نے بنائی، تو کیوں بنائی ہے
رحیم تو ہے تو کیوں درد و غم کے کوہ گراں

غریب و بیکس و مجبور کو کچلتے ہیں
جمیل تو ہے تو پھر اس عروسِ گیتی کے
حسین چاند سے چہرے میں یہ گہن کیوں ہے
یہ ظلم کیوں ہے، اذیت ہے کیوں، بدی کیوں ہے

ہارڈی کو انسانوں کا پیغامبر بنا کر دربار ایزدی میں بھیجا گیا تھا۔ مگر کلیم صاحب از خود اپنے قلبی کوائف اور فکر انگیز حقیقت پرستانہ رجحانات سے مجبور ہو کر حضورِ یزداں اپنے خیالات کا دلیرانہ اظہار کر رہے ہیں۔ کلیم صاحب کو سوال کا جواب کچھ نہ ملا، خاموشی، بے التفاتی اور بیزاری کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا ــــ

تلاش میں نے بہت کی، وہ قادرِ مطلق
ہزار پردوں میں منہ کو چھپائے بیٹھا تھا
یہ سوچا میں نے کہ پوچھوں سکوتِ دریا سے
بتلائے راز وہ سرچشمۂ حقیقت کا
فرازِ کوہ سے پوچھا مرا وہ عرش نشیں
زمیں سے دور فلک پر کہاں چھپا ہے بتا
نہ پھولوں ہی نے بتایا، نہ راز شبنم نے
پیمبروں سے بھی پوچھا، جواب کچھ نہ ملا

اسی طرح مسلسل تین ٹکڑوں میں اس حرمان نصیبی کا ذکر ہے، جواب کچھ نہ ملا، ــــ ہارڈی نے مسلسل جوابات حاصل کئے ہیں اور خدا سے ہمکلام بھی ہوا ہے، آخر حصہ میں کلیم صاحب اپنے سارے تجربات تلخ و خاموش تیز اور

پُرجوش حاصل کر کے یزداں کے جواب کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہ بھی ایک موثر اور دل آویز طریقۂ بیان ہے۔

شاعر نے اس ذہنی معراج کو مادیت اور روحانیت دونوں کا سنگم بنا کر پیش کرنا چاہا ہے، وہ اپنا سفر جاری کیے ہوئے ہے۔ جواب نہ پانے سے اس کی طبیعت میں افسردگی نہیں آتی، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ نہیں رہتا۔ وہ آسمان پر پہنچا، ستاروں سے پوچھا، چاند سے دریافت کیا، وہ نیلگوں خلاؤں کو طے کرتے ہوئے آگے بڑھا، بڑھتا ہی گیا، طرح طرح کے نور و نار کے نظارے سامنے آئے۔ سورج کو پگھلتے دیکھا اور آگ کو اُبلتے دیکھا، لیکن جواب کچھ نہ ملا:

میں آگے بڑھتا گیا نیلگوں خلاؤں میں
نہ عرش تھا، نہ ملائک کہیں، نہ حوریں تھیں
مری تلاش مجھے لے گئی پھر ایسی جگہ
جہاں سے ظلمتِ شب کو ملی تھی تاریکی
محیط چاروں طرف اک دھواں تھا ظلمت کا
نہ نور تھا نہ یہاں نور کے نظارے تھے

اب ہارڈی کی مذکورہ نظم کا ابتدائی ٹکڑا پڑھیے:-

I towered far, and lo, I stood within
The presence of the Lord Most high
Sent thither by the sons of Earth, to win
Some answer to their cry

کلیم الدین احمد

اللہ تعالیٰ جمیل ہے وَاللّٰہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَال کے تحت وہ اس آئینہ میں دنیا کا عکس دیکھنا چاہتا ہے؛ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قہار و جبّار بھی ہے اور شاید اسی لیے ظلم و استبداد کی فضا چھائی ہوئی ہے، اسی لیے اس رحیم کی رحمت کے بھکاری، محتاج، بیکس و نادار اور بھی کچلے جا رہے ہیں، شاعر اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے۔ آسمانوں کو روندتا ہوا بڑھا جا رہا ہے۔ کچھ اس طرح شوخ ہے کہ بات کرنے کا سلیقہ نادان کو تو نہ آیا۔ لیکن ایسے نادان اپنے قربِ یزدانی کا راز فاش کر جاتے ہیں۔ یہ شوخی وہی کر سکتا ہے، جو محرمِ رازِ درونِ کائنات ہو۔

اب خدا کی آواز آتی ہے اس مقام سے:

یہ وہ مقام تھا ظلمت کا جس کو دل کہیے
کہ اتنے میں یہ صدا گونجتی نظر آئی
یہ کون آیا ہے میرے حصارِ ظلمت میں

شاعر کو یہ گونجتی ہوئی صدا سنائی دی اور وہ اب تلاشِ یزداں میں ایک طرح سے کامیاب ہو گیا اس لئے شکوہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

کہا یہ میں نے کہ اے کائنات کے خالق
میں تیری قدرتِ مطلق کا اک کرشمہ ہوں
تری خلاؤں کے گوشہ میں ایک سیّارہ
جو اک نگار سراپا ہے حسن و رعنائی
زمیں جسے یدِ قدرت نے خود سنوارا ہے

اسی زمیں میں یہ انسان تیرے بستے ہیں
جو صبح و شام ہیں مشغول حمد میں تیری
تجھے خبر ہے کہ کیسے ہیں ان پہ سخت ایام
اور ان غریبوں کے اوقات تنگ ہیں کتنے
وہ تلملاتے، تڑپتے ہیں، آہ کرتے ہیں

اب ہارڈی کی نظم کے یہ مصرعے پڑھیے :۔

But Syest'it is by pangs distranght
and strife and silent suffering
Sore grieved am I,that injury should be wrought
Even,on so poor a thing

لیکن کلیم صاحب چونکہ اسی آواز یزداں سے مخاطب ہیں۔ اس لئے جرات پر جرأت کا اظہار ہو رہا ہے، وہ بہت سارے سوالات کر بیٹھتے ہیں۔ ان کا دل اندر سے پریشان ہے، انسانیت کی مجبوری اور بے [illegible] دیکھ کر وہ کلیجہ مسوس کر رہ نہیں جاتے، بلکہ کہتے ہیں :

رحیم تو ہے تو انسانیت کا خوں کیوں ہے
فساد کیوں ہے تنازع ہے کیوں، فنا کیوں ہے
یہ دنیا تو نے بنائی، تو کیوں بنائی ہے
اسے نبانا تھا، لیکن نہ یوں نبانا تھا

یہ ہے طنطنۂ کلیمی، بہ قول شاعر:

کہدو نقاش ازل سے کہ پھر اس دنیا میں ؛ ہم سا مجبور نہ انساں کوئی پیدا کرنا

تابڑتوڑ اتنے سوالات کے جواب میں ایک خاموشی ، وہی پُراسرار سکوت ،——
لیکن سکوت کے بعد جیسے کسی کو بھولی ہوئی ، بیتے دنوں کی یاد آتی ہو ، دھیرے دھیرے پرانے نقوش اس کے لاشعور سے الفاظ کی شکل اختیار کر رہے ہیں :-

مگر سُنا کہ کوئی زیر لب یہ کہتا ہے
زمین کیا ہے یہ انسان کس کو کہتے ہیں
میں سوچتا ہوں مگر یاد کچھ نہیں آتا

اب ہارڈی کے دو مصرعے ملاحظہ ہوں :

Nay:"I have no remembrance of such place
Such world I fashioned not"

اور جب اس کو باتیں یاد دلائی جاتی ہیں ، وہ کہہ اٹھتا ہے :

"Thou shouldst have learnt, that Not to mend
for me could mean but, Not to know"

مرا تو کام ہے خلّاقی اور خلّاقی
میں دم بہ دم نئے نقشے بنائے جاتا ہوں

Some tiny sphere I built long back
(Mid millions of such shapes of mine)
So named —

اب یزداں کو یاد آ گیا کہ کوئی انسان اس نے بنایا تھا ، لیکن کمزور کمزور قسم کی مخلوق ، اور زمین .... زمین بھی اس نے بنائی تھی ۔ مگر اس کو یہ علم نہ تھا کہ یہ زمین کے باشندے اور یہ زمین اب تک باقی ہے اور وہاں حیات و موت کے جھگڑے آئے دن اُٹھتے رہتے ہیں جو خیر و شر کے فساد سے ضمیر امکان کو کثیف سے

کثیف تر بنا رہے ہیں، یہ صحیح ہے کہ فرشتوں نے آدم کی خلقت کے پہلے ہی یزداں کو یہ کہہ کر آگاہ کر دیا تھا کہ یہ آدم متضاد عناصر کے اجتماع سے وجود میں آیا ہے اس لئے کبھی یہ ایک نقطہ پر متحد نہیں رہ سکتا، یہ زمین پر شر و فساد پھیلائے گا خوں ریزیاں کرے گا، مگر ہم فرشتے صرف عبادت ہی کر سکتے ہیں کہ ایک ہی عنصر نے ہم کو ایک ہی جذبہ عطا کیا ہے۔

مجھے خبر نہیں، یہ خیر کیا ہے شر کیوں ہے
حیات و موت کے جھگڑے کہاں سے آئے ہیں
فساد کیا ہے، اذیت ہے کیوں، ستم کیا ہے

اسی آخری ٹکڑے میں ہارڈی کی دوسری نظم جس کا نام اوپر گذر چکا ہے۔ ہر طرح اثر انداز ہے۔

یہ حسن و عشق کی رنگین داستاں کیا ہے
تلاش کیا ہے، خودی کیا ہے اور منزل کیا

ہارڈی کی نظم کے یہ مصرعے پڑھئے:

I saw him steal the light away
That haunted in her eye
It went, so gently none could say
More than that it was there one day
And missing by and by

اب نظم کے آخری مصرعوں پر آیئے، یہ صناعی جگر کاوی، رفعت خیالی اثر آمیزی اور ایک مختار مجبوری کا فن کارانہ اظہار ہے۔

شکوہ ہائے بہم سے اب خدا کو پرانی باتیں یاد آجاتی ہیں، ندامت شرما جاتی ہے، اور قدرت کو غیرت آجاتی ہے اور خدا اپنی خدائی کی قسم کھا کر آوارگی زلف برہم کا وعدہ کر لیتا ہے، اقبال بھی جواب شکوہ میں یہ مقام حاصل نہ کر سکے، گرچہ ایک بڑا فرق دونوں میں برقرار رہا۔ اقبالؔ کا جواب شکوہ اعتراف شکست خالق نہیں اور کلیم صاحب کا یہ جواب اعتراف شکست خالق ہے:

اگر ملی مجھے فرصت کچھ ان جھمیلوں سے
تو اس زمین کو میں اپنا گھر بناؤں گا
میں دل بنوں گا، بتاؤں گا درد دل کیا ہے
قسم خدا کی میں سیکھوں گا جراءت پرواز

انسان سے تعلیم حاصل کرنا، اس کی تکلیف و اذیت کو اپنی خدائی کے عرفان کا واسطہ بنانا ایک قابل قبول خیال ہے۔ اب ہارڈی کی نظم کا آخری حصہ دیکھئے:

Said I : "we call that cruelty—
We, your poor mortal kind"
He m used "The thought is new to me
torsooth, though I man's master be
Their's is the teaching mind"

کلیم صاحب اس نظم میں ہر جانبداری اور ہر پابندی سے الگ رہے ہیں وہ صرف انسان ہی کی بگڑی سنوارنے میں سارے عالم کی نجات دیکھتے ہیں، یوں یہ کہیئے کہ سارے مذاہب نے تنگ دائرہ سے تبلیغ شروع کی۔ اس کے

بعد ایک وسیع دائرہ تک آ گئے۔ مگر یہ ابتدا ہی سے وسیع دائرہ کی طرف مائل ہیں۔

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

کلیم صاحب نے اپنے کو ہر طرح کے جذبِ خاک سے آزاد کر لیا ہے۔

(۲۳) یہ قطعہ ۳۲ مصرعوں کا ہے، اس میں انسان اور خدا کے باہمی رشتے خالق اور مخلوق کے ربط کو جدید نظریہ کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی اشرف ترین مخلوق کو دل سے نوکر دیا، اور انسانیت اب جتنا بھی چیخے، کراہے، اس نے اپنا سارا رشتہ توڑ لیا ہے، اسی لئے مجبوراً انسان نے طرح طرح کے خدا بنا لئے، یہ نظریہ کہ انسان کو خدا نے بنایا، اب اس نظریہ کے تحت دیکھا جا رہا ہے کہ انسان نے خدا کو بنایا، جو انسان کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر ہے:

ظاہر بھی مجھ سے، باطن بھی مجھ سے
اوّل بھی میں ہوں، آخر بھی میں ہوں
میری خودی نے یزداں بنایا
اللہ اکبر، اللہ اکبر

بقول جمیل مظہری:

وہیں تک خودی ہے، وہیں سے خدا ہے
جہاں سے خودی ڈھونڈتی ہے سہارا

انگریزی فلسفہ، انگریزی شاعری اور انگریزی عروج و اقتدار نے کلیم صاحب پر گہرا اثر ڈالا ہے، وہ درد مند دل وراثت سے پائے ہیں، اقبال بھی درد مند دل

رکھتے تھے، اُن پر بھی انگریزی عروج و اقتدار، انگریزی فلسفہ حیات کا کافی اثر تھا، مگر وہ اس کیف کو مشرقی شراب میں انڈیل دیتے ہیں اور وہ پرانے جام پر ہی اکتفا کرتے رہے، کلیم صاحب نے ان سارے تاثرات کو، ان سارے تجربات کو، ان سارے عواقب امور کو محسوس کیا اور نئے انداز میں، مغربی رنگ میں، غیر متعلق انداز میں، رمز و کنایہ کی زبان میں، مگر واضح اور ٹھوس پیرایہ بیان میں پیش کر کے ہمارے سامنے اُردو شاعری کے امکانات وسیع کر دیئے۔

حضرت انسان کی بلند منصبی، ان کے اختیار، ان کے اطوار، ان کے کردار کا تقاضا ہوا، حسن رخشاں نمودار ہوا، عشق کی تخلیق ہوئی اور یہیں سے خیر و شر بھی پیدا ہو گئے۔ کفر و ایمان وجود میں آئے اور نور و ظلمت ظہور میں آئے، جب سکون کی ضرورت پڑی انہوں نے جنت بنا ڈالی، جنت میں زندگی کی ساری رعنائیاں بھر دیں اور ان رعنائیوں کو بام میں لانے کے لیے آدم و حوّا بنائے گئے اور جنت میں بسا دیئے گئے، پھر :-

جنّت سے ان کو میں نے نکالا
میں نے نکالا، دوزخ بنائی
ایک آگ اس میں ایسی جلائی
جس کی تپش سے دنیا ہے لرزاں
روحوں کو اس کا ایندھن بنا کر
میں نے جلایا، میں نے جلایا

یہ حضرت مسلسل آرام و عیش دوام سے اس طرح گھبرا گئے اور اتنا جلد اُکتا گئے کہ انہوں نے جنت کا تضاد پیش کرنے کو دوزخ بنا ڈالی کہ انسان کی جبلت میں

تضاد ہی کا عمل دخل ہے، اب اس کے کرتب چمکنے لگے، شیطان اور فرشتے اس کے آگے جھکنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کا "انا" بیدار ہوا، بیدار ہوتا گیا اور اس نے اپنی پسند کے خدا بنائے۔ دنیا کے موجودہ جھگڑے جھمیلے، شر کا نرغہ، خیر کی پسپائی، انسانیت سوز مظاہرے، ننگ وجود آدم اعمال، حسن کی رسوائیاں، عشق کی بدنامیاں، روح کی گندگی، اخلاقیات کی درماندگی دیکھ کر شاعر کا دل پکار اٹھتا ہے کہ یہ سب خرافات تو ہماری ہی ایجاد کردہ ہیں، اور اب ہم اپنی ہی پیدا کردہ جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں اور اپنے ہی تخلیق کردہ خدا کے ہاتھوں رسوا ہو رہے ہیں، پتہ نہیں اس کو کیا کہوں، اسلام دوستی یا انسان دوستی، حق پرستی یا انسان پرستی۔ مگر ہے وہی جو ہم سب محسوس کرتے ہیں کیسے سلیقہ سے کہنے کی باتیں کہی گئی ہیں اور کس تمیز سے نہ کہنے کی باتیں بھی کہہ دی گئی ہیں۔ یہ کلیم صاحب کا ہی حصہ ہے کہ ان کے یہاں صداقت حسن ہے اور حسن صداقت۔

یہ کاخ و ایواں، یہ حور و غلماں
یہ عرش و کرسی، یہ شاخ طوبیٰ
جن و ملائک میں نے بنائے
جبریل میرا، شیطان میرا

یہ نظم جلد جلد ارتقا کی طرف چلی جاتی ہے، عروج کا ایسا ابھرا ابھرا نشان ہے کہ زبان خاموش ہو اور ادھر صرف اللہ اکبر بے ساختہ منہ سے نکل پڑے، ___ ان سارے نظریات کے تحت اگر قرآن پاک کے اس قول کی طرف بہ نظر امعان دیکھا جائے ونفخت فیہ من روحی (میں نے اپنی روح انسان میں پھونک دی) یا یہ قول کہ اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، تو

گذرے ہوئے بیانات میں جو الحاد یا بداعتقادی کی بو آتی ہے، وہ ختم ہو جائے۔

(۲۴) اس مجموعہ کی پہلی سب سے طویل نظم یہی ہے۔ جو ۳۳۲ مصاریع پر مشتمل ہے، اس نظم کا مرکزی خیال کالی داس کی میگھ دوت سے لیا گیا ہے۔ اس کی تحریک ادبی اسی کتاب کے مطالعہ سے ہوئی ہے، یہاں پر نامناسب نہ ہوگا۔ اگر میگھ دوت کو مختصر طور پر آپ سے روشناس کردوں۔ میگھ دوت کے معنی ہی ہیں، پیغام بر بادل، اس کا ہیرو یکش YAKSHA نام کا ایک شخص تھا، ہیروئن اس کی اپنی بیوی تھی، کیلاش پہاڑ پر الکا، نام کا ایک شہر تھا، جہاں یکش اور اس کے لوگ رہتے تھے۔ ان کے بادشاہ کا خطاب کوبھرا تھا (CUBHERA) اس کے لفظی معنی ہیں، ثروت و دولت میں فخر روزگار، اور واقعی یہ سارا قبیلہ بڑا ہی متمول تھا اور عیش و عشرت سے زندگی گذار رہا تھا، کوبھرا شیو کا پجاری تھا اور یکش کو اس نے ایک معزز مالی کا کام انجام دینے کے لئے رکھ لیا تھا، یکش جوان تھا، شادی ہوئی، بیوی بڑی حسین نازک اندام اور رعنائیوں کا پیکر تھی، یکش اپنی ازدواجی زندگی میں کچھ زیادہ منہمک ہونے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتنے لگا۔ کوبھرا کی پوجا میں دیر ہونے لگی اور اس کی عبادت میں خلل پڑنے لگا، کوبھرا کو آخرکار یہ بات معلوم ہو گئی تو یکش کو اس نے ایک سخت سزا دی، اسے چترکوٹ پر ایک سال کے لئے قید کردیا، لیکن وہاں اُسے تنہا جانا پڑا، بیوی اسی شہر میں رہ گئی۔ اسی قید و بند کے حال میں برسات آئی اور یکش کو بے ساختہ اپنی بیوی کی یاد ستانے لگی، وہ عیش و کامرانی کے دن، مسرت کی راتیں یاد کرکے تلملا اٹھا، مگر کیا کرتا مجبور، اتنے میں اس کی نظر بادلوں پر پڑتی ہے، وہ بادلوں کو اپنا مخبر بناتا ہے، اس کو

اپنا سندیسا کہتا ہے اور جلد جلد پیغام رسانی کی فرمائش کرتا ہے، اپنے پیغام میں یکش مناظر قدرت کا ذکر کر کے اہم مقامات کا پتہ دے کر اس کو راستہ بتانا چاہتا ہے۔ پیغام کا آخری حصہ بڑا ہی المناک ہے اور شاید یہی نقطۂ عروج ہے پیغام یہ ہے۔

"جب بے چینی زیادہ ہوتی ہے، تو میں پتھر پہ تیری صورت بنا لیتا ہوں اور جب چومنے کے لئے چرن کو چھونا چاہتا ہوں، تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں، اس طرح بھر جاتی ہیں کہ میں تمہاری تصویر بھی دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہوں"

त्वामालिख्य प्रणयकुपितां धातुरागैः शिलाया-
मात्मानं ते चरणपतितं यावदिच्छामि कर्तुम् ।
अस्रैस्तावन्मुहुरुपचितैर्दृष्टिरालुप्यते मे
क्रूरस्तस्मिन्नपि न सहते संगमं नौ कृतान्तः ॥

یہ ہے شاعری میں مصوری اور مصوری میں شاعری۔ کلیم صاحب نے بھی شاعری میں مصوری کی ہے، ملاحظہ ہو:

مری اداس آنکھوں میں
ستارے جگمگائیں گے
مرے یہ خشک خشک ہونٹ
ہنسیں گے لال لال پھول

میں نے پہلے کہیں بتایا ہے کہ کلیم صاحب کی زندگی میں نشاط کا عنصر غالب رہا ہے، وہ مایوسی میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور ناکامیوں سے کام لینے کا طریقہ ہمیں بتا دیتے ہیں۔ وہ زندگی کو لائق زیست بنانا چاہتے ہیں یہاں بھی یکش کا پیغام تھا کہ غم میں جی اتنا نہ ہلکان کرو کہ موت آجائے، غم میں

۲۴ نظمیں کلیم الدین احمد کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے، جو ۱۹۶۵ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا، ان کا دوسرا مجموعہ ۲۵ نظمیں کے نام سے اگست ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ کلیم صاحب نے "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" لکھ کر اردو دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ جس آزادی و بے باکی سے وہ قدیم رواج یافتہ اردو شاعری کی بے بضاعتی اور تہی مائگی کا راز فاش کر گئے ہیں، اس سے ان کی جرأت اظہار، ہمتِ گفتار اور صلابتِ کردار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ کلیم صاحب ایک خاموش طبیعت اور پُرسکون طریقۂ زیست کے مالک ہیں۔ یہی خاموشی اور سکون ان کی زندگی کے ہر موڑ پر موجود ہے، وہ چپ چاپ تنقید کی دنیا میں داخل ہوئے اور اب خاموشی سے شاعری کے تخت پر جلوہ آرا نظر آتے ہیں۔ نہ کبھی اپنی شاعری کا ڈھنڈورا پیٹا، نہ کسی سے تذکرہ کیا، اور نہ ہی کسی طرح یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ اپنی طبیعت میں کتنی موجہائے تند و تیز چھپائے بیٹھے ہیں اور ان کے

مرجانا کمال نہیں، زندہ رہنا کماں ہے اور زندگی میں غم کے دھاروں کو موڑ دینا، اور ان کی لہروں کو خوشی کی لہروں سے بدلنا ہی راز کامیابی ہے۔

اسی امید پر وہ انتظار کی تلخیاں انگیز کرتا جا رہا ہے۔ اگر انتظار اور امید نہ ہو تو انسان کوئی بڑا کام انجام دینے کے لائق نہیں رہ سکتا، شاعر اپنی خیالی دنیا میں پرواز کر رہا ہے، مگر کوئی اس کی طرف مخاطب نہیں ہوتا، وہ اُوپر کو جا رہا ہے، عقاب سے پوچھا، غباروں سے دریافت کیا، کوئی پتہ نہ پایا:

ہوائیں بولتی نہیں
خلائیں بولتی نہیں
کدھر ہے بال جبریل
یہ روز و شب، یہ ماہ و سال
یہ سب کے سب خموش ہیں
کسی کو کچھ خبر نہیں

پھر بھی وہ اُمیدوں کا جال بُن رہا ہے اس طرح اپنی زندگی کی کشش برقرار رکھے ہوئے بہت سے خیالی پُلاؤ پکا رہا ہے اور طرح طرح سے اپنی والہانہ شیفتگی کا اظہار کر رہا ہے:

خیال ہے تو بس یہی
جو آس ہے تو بس یہی
وہ تیز رَو، وہ تازہ دم
وہ بے مثال ایلچی
وہاں سے لوٹ آئے تو

پیام اس کا لائے تو
گلوں کا اس کا ہار دوں
بہارِ بوستاں بھی دوں
یہ چاند، تارے اس کو دوں
نگارِ آسماں بھی دوں

اسی طرح وہ اس عالم انتظار میں اپنے دل کی ڈھارس بندھا رہا ہے، جیسے جیسے وہ نراس ہوتا جا رہا ہے، اپنی قیمتی سے قیمتی شئے اس کو نذر کرنے کو تیار ہو رہا ہے، اپنی آنکھیں، اپنا دل بلکہ اپنی جان تک اس پر نثار کرنے کو وہ باعثِ نجات و خدمتِ حیات تصور کرنے لگتا ہے۔ مگر یہ سب بکواس ہے۔ ابر تیز رَو نے ایک نہ سنی وہ صاعقہ وحق چلا گیا۔ وہ ابر تیز رَو رخصت ہو گیا ہمیشہ کے لئے، وہ انتظار کرتے کرتے تھک گیا، شاید ابر تیز رو بھی سفر کی صعوبتوں سے تھک گیا، یا راہ سے بھٹک گیا:-

وہ کھو گیا، وہ کھو گیا
وہ اب کبھی نہ آئے گا
وہ اب کبھی نہ آئے گا

جب ہر طرح سے وہ مایوس ہو کر تھک ہار کر خاموش ہوا، تو یکایک وہ لازوال ایلچی نمودار ہوا، وہ ابر تیز رَو تیز تیز چلتا ہوا، ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا آ رہا ہے۔ جواب محبوب لے کر آ رہا ہے، اب اس کی تنہائی کے دن ختم ہوئے اور خوشی و کامرانی کے ایام حاصل ہوں گے، مگر جب ابر اور نزدیک ہوا، تو اس کے ہوش اُڑ گئے، حواس بجا نہ رہے، اللہ کی پناہ! یہ ابر تیز رَو کیسا پُر غضب ہے

قہر آلود نگاہوں سے تاکے جا رہا ہے اور ساری فضا پر اپنے غیض و غضب بکھیر رہا ہے، زمین لرز رہی ہے۔ آسمان کانپ رہے ہیں، ستارے تھرا رہے ہیں۔ چاند ماند ہو گیا، چشمے سوکھ گئے، پھول مرجھا گئے، بہار لٹ گئی، لالے سرنگوں ہو گئے:۔

یہ ابر ہے کہ فیل مست
جو یوں فلک پہ ہے رواں
وہ کیوں ہے اتنا طیش میں
یہ غیظ، یہ غضب ہے کیوں
یہ گھڑکیاں ہیں کس لئے
وہ گھورتا ہے کیوں مجھے
وہ دانت پیستا ہے کیوں
یہ ہمہمہ، یہ چیخ کیوں

یہ فطرت کی سرزنش ہے انسان پر کہ اس انسان نے نائب خدا نے کیا سے کیا کر دیا، دنیا اسی کے لئے بنائی گئی، ساری کائنات اس کے تصرف میں کر دی گئی

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

مگر وہ اپنی غفلت سے تن آسانی کے باعث اعلائے کلمۂ حق میں، خدمت خلق میں، کوتاہ کار نکلا۔ اس لئے مناظر فطرت قہر و طیش میں ہیں، وہ ابر تیز رو، وہ فیل مست بے زنجیر چنگھاڑتا ہوا، دیوانہ وار، ایک دیو قوی ہیکل کی طرح گرجتا ہے، وہ ایسی زمین دیکھنا نہیں چاہتا، وہ ایسے آسمان کو بھی نظر سے دور رکھنا چاہتا ہے، وہ حیات بے مایہ سے بھی متنفر ہے اور یہ کہتا ہوا گذر رہا ہے:۔

مٹا دو اس زمین کو
مٹا دو آسمان کو
اُلٹ دو کائنات کو
طنابیں اس کی توڑ دو
حیات بے بساط کی
بساط آج تہہ کرو

اپنی ناراضی کے اظہار کے بعد، اس ابر تیز رَو کا اس صاعقہ فگن کا لہجہ نرم ہوتا ہے، وہ خود ابر نرم رَو بن جاتا ہے اور دھیرے دھیرے پیام یار سُناتا ہے:

سنو یہ ابر نرم رَو
پیام دے رہا ہے کیا
میں کیا سنوں، میں کیا کہوں
میں اب کبھی نہ آؤں گا

اب یہ معمورۂ حیات اس لائق نہیں رہا کہ میں بار دگر آسکوں، انسان ظالم و جاہل بن گیا، میں نے اسے کیا کیا نہ دیا، زمین دی، سر بفلک پہاڑ دیئے، یہ چشمے دیئے، یہ آبشار دیئے، یہ دشت و جبل، میں نے اسے بہار کا مالک بنایا خزاں پر اس کی دسترس رکھی، نظام حیات سونپا، اسے زمام کائنات بخشی، ساری فضاؤں پر قدرت عطا کی، مگر وہ جاہل تھا، نادان تھا، اس نے اپنی جہالت اور نادانی کا ثبوت دیا، اس نے زمین کا ستیاناس کر دیا:

زمیں کو ناس کر دیا
مجھے نراس کر دیا

اس نے پھول کو خار بنا دیا، بہار کو خزاں کے بدلے فروخت کر ڈالا۔ نور سے نار بدل کر خوش ہو گیا، شرر کے عوض سنگ لے کر مگن رہنے لگا۔ وہ آئینہ سے اُکتا گیا اور صیقل آئینہ کے بدلے زنگ کدورت اپنے چہرے پر مل لیا، میں نے اُسے عقل عطا کی، عشق سرفروش عطا کیا، تمیز و خیر و شر بتائی۔ مگر سب بے سود ثابت ہوئیں:

مگر یہ تُو نے کیا کیا
زمیں کو بھی لُٹا دیا
فلک کو بھی لُٹا دیا
خدا کو بھی لُٹا دیا

ظلم، جبر، استیلا، غصب حق، کذب افترا، عصیان، بغاوت اس کا شعار ہو گیا، مفلسی، رہزنی اس کا وتیرہ بن گیا، وہ سکون آشنا، سکوں پرور اب فساد آشنا اور باطل پرور بن گیا، وہ خون کی ندیاں بہانے لگا۔ معصوموں کے لہو میں نہانے لگا۔ وہ مظلوموں کی آہ سے بے خبر ہو گیا۔ اپنی سرکشیوں میں محو، اسے دوسروں کی فکر نہ رہی، خلق خدا کی فکر نہ رہی، اس خراب آباد میں اب ہر جگہ آہ و فغاں ہے، ہر جگہ شور الاماں ہے، مگر انسان ان سے غافل ہو گیا ہے۔ اس کی دنیا میں ملامتیں ہیں، خصومتیں ہیں، عداوتیں ہیں، فتنہ و فساد ہے، جنگ کا عذاب ہے۔ دنیا کیا ہے مقتل حیات ہے، یہاں جبر و تشدد کا عفریت پھنکار رہا ہے۔ شقاوتوں کے بھوت سر پہ ناچ رہے ہیں، یہاں حسن کے چہرے بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ عشق کو رسوا کر دیا گیا، اس لئے خدا بھی روٹھ گیا ہے:-

میں کیسے مُنہ دکھاؤں اب

میں کس کو منہ دکھاؤں اب
سجاؤں بزم کس طرح
تری حسیں زمین میں
میں گھر بناؤں کس طرح
میں اب کبھی نہ آؤں گا

انسان کو چاہیے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کی تلاوت کرے، اسی کے تحت پیام مشرق کے دیباچہ میں اقبال نے جامع اور موثر انداز میں اشارہ کیا ہے۔ کالی داس کی اس نظم سے میں اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ کالی داس کی اس نظم میں غم کا طوفان اور جذبات کا ہیجان ہوتے ہوئے بھی نشاط و انبساط کا امکان سامنے آجاتا ہے۔ حکیم صاحب کے یہاں نشاط و انبساط کے امکانات تو ہیں مگر غم کا طوفان امڈتا ہوا نہیں ملتا۔ یہ اس لئے کہ ان کا مقصد اس نظم سے کالی داس کے مقصد سے علیحدہ ہے۔ صرف ایک قدر مشترک یہ ہے کہ انسان اگر اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرتا ہے تو قدرت اس کو سزا دے کے دم لیتی ہے اور انسان کو اس کی ذمہ داریوں سے غافل کر دینے میں حوّا کی بیٹیوں ہی کا ہاتھ ہے۔

اس نظم کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) اس میں پیغام ہے، یہاں منظر نگاری نہیں ہے، جس سے پیغام کا اثر ساری فضا پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے (۲) اس حصّہ میں انتظار ہے، شدّت انتظار مایوسی پر ختم ہوتی ہے اور ساری امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ (۳) باد دگر امید کی کرن پھوٹتی ہے، وہ پیغامبر نمودار ہوتا ہے، مگر غیض و غضب میں بھرا ہوا قہر و جبر کا نشان بن کر، پیغام دینے والے سے متنفر، پیغام کا جواب آیا ہے، لیکن جواب اتنا مختصر ہے کہ اس سے

ابر بہار کے یلہ نے ناامیدی بڑھ جاتی ہے۔ (۴) اس حصہ میں جواب کا ردعمل ہے۔ انسان نے اس جواب کو کس طرح لیا، یہ لہجہ ذرا شوخ ہے۔ انسان خود کو بری الذمہ کہہ کر مطمئن ہو جانا چاہتا ہے۔ لیکن معاً بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے، یہ اعتراف جرم ہے اور عبادت عفو، اب دوبارہ پیغام رسانی کی جاتی ہے اور انسان کو اپنے رتبہ کا احساس صحیح طور پر ہو جاتا ہے، اس کو اپنے نفس کا عرفان ہوتے ہی اپنے رب کا عرفان بھی ہو جاتا ہے۔

شاعر کا دل انسان کی نااہلی، اس کی سفاکی، حق ناشناسی اور چیرہ دستی سے گھبراتا ہے، فطرت سے اپنے آنسوؤں کے خشک ہونے کی تدبیر ادھار مانگتا ہے زمین والوں کی حشر خیزیاں، آسمان باشیوں کو بھی متوحش کر رہی ہیں۔ ابر تیز رو حیران کسی دھن میں بھاگتا نظر آ رہا ہے۔ شاید اہل زمین کی فتنہ زائیوں سے عاجز آ کر خالق کائنات کے حضور پیام لے کر جا رہا ہے، اسے جلدی ہے کہ پوری دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے، شاعر اسی کو پیغام بری کے لئے منتخب کرتا ہے:

سُن اے سبک رو فلک
ذرا مری بھی بات سُن
بتا وہ میرا مہ جبیں
وہ میرے دل کی روشنی
وہ حُسن، حُسنِ جاں گزیں
وہ جان، جانِ زندگی
خفا ہے کیوں، یہ کیا ہوا

کہ مجھ سے روٹھ کر وہ یوں
نظر سے دُور جا چھپا
زمیں سے دُور جا چھپا

شاعر، ابرِ تیز رَو کو اپنے پیامبر کو یہ پیام کہتا ہے، اس سے مخاطب ہو کر یہ پوچھتا ہے کہ وہ جانِ زندگی آج کل کیوں اس سے خفا ہے، اس نے کوئی تقصیر ایسی تو نہ کی، جس کی یہ سزا ملے۔ اور اس کی محبتوں کا، اس کی گداگری کا، اس کی نیازمندی کا تغافل اور کم التفاتی سے جواب دے، وہ صورتِ سوال بن کر اِدھر اُدھر محوِ جستجو ہے۔ مگر وہ محبوب روپوش ہی ہے، بہار خاموش ہے، خزاں مُہر بہ لب ہے، زمین کا کونہ کونہ چھان مارا، فلک کو ناپ ڈالا، دل سے آرام تیاگ دیا، عیش چھن گیا، صحرا و بیاباں دم بخود ہیں، مگر وہ زندگی کی ہماہمی سے ناآشنا بنا ہوا، انسانوں کی کراہ سے بے خبر ہے:

نہ جانے کیوں وہ مہ جبیں
نظر سے دُور، دل سے دُور
زمیں سے دُور چھپ گیا

اب اسے اپنے محبوب کی یاد آنے لگی، وہ اس کے جلووں کو دنیا کے ذرّہ ذرہ میں برملا دیکھتا ہے۔ وہ اس کو ہر جگہ موجود پاتا ہے۔ اس کے بغیر کائنات کی کسی شئے کا وجود ہی نہیں، ہمہ اوست کا مظاہرہ دیدہ بینا کی تلاش میں ہے:

وہ زلف پُرشکن میں ہے
وہ چشمِ سحر فن میں ہے
سخن کے بانکپن میں ہے

وہ راز جو وہ رازداں
یہ کہتے ہیں کہ بے گماں
وہ چاند کی چمک میں ہے
وہ پھول کی مہک میں ہے
وہ شعلہ کی لپک میں ہے

شاعر، جذبات کے تیز دھارے میں اس طرح گم ہے کہ جانے کیا کیا بک گیا، جب اس کا شعور قدرے بیدار ہوا، تو کہہ اٹھا۔

'بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو'

یہ شوخی اور یہ جرم، حضرت موسیٰ کے چرواہا کی طرح وہ بے باک شاہدِ رعنا سے ہمکلام ہے، مگر اس کو اپنی کم مائگی کا جلد ہی احساس ہو جاتا ہے:

کہاں وہ میرا مہ جبیں
کہاں یہ زلفِ پرشکن
کہاں وہ دل کی روشنی
کہاں یہ شعلہ کی لپک

دفعۃً جذبات میں داستان کو کس طرح طول دے دیا۔ ابر تیز رَو کی زبانی پیغام اتنا طویل ہے کہ پیغام دینے والے کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی، وہ اپنے دل کا حال بتاتا جا رہا ہے، وہ اپنی محرومی کا اظہار کرتا جا رہا ہے، جب وہ گلشن میں جاتا ہے، تو خار سُکڑ پڑتے ہیں، گُل مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ پاؤں کے آبلے زنجیر پا بن گئے، پاؤں تھک گئے، آنکھیں تھک گئیں، دماغ شل ہو گیا، مگر جستجو کا کوئی حاصل نہ نکلا:۔

میں کیا کروں، کسے کہوں
سوال سُن! یہ حال دیکھ

مگر اس کے حال زار پر کسی کو رحم نہیں آتا ہے، ہر شئے اس سے گریزاں ہے، فطرت کی ایک ایک تخلیق اس سے متنفر ہے، اس نے اپنے محبوب کا، اس حُسنِ کل کا، اس خالقِ کائنات کا کچھ بھی حق ادا نہ کیا، اس نے نائب بن کر رقابت کی اس نے امین بن کر خیانت کی، اس کا احساس دم بہ دم اس کو جھنجھوڑتا ہے۔ مگر وہ تو مجبور ہو گیا اپنے ملحد سماج سے، سفاک اور حق ناشناس ماحول سے، اس کی اس میں تقصیر کیا، اس کی نیت تو صاف ہے، اس کا دل تو صاف ہے، وہ اپنی محبت میں مخلص تو ہے:

اگر ملے وہ مہ جبیں
تو کہہ: میں بے قصور ہوں
یہ دل پہ کیوں عتاب ہے
یہ جاں پہ کیوں عذاب ہے

اب پیام کا آخری حصہ پڑھیے، یہ سراپا محبت اور اپنی مجبوری، پھر اپنی استعداد محبت کا ایک نقش پیش کر دیتا ہے:

وہ دل میں میرے آئے تو
میں سینے سے لگاؤں گا
میں آنکھوں میں بٹھاؤں گا
میں درد دل سناؤں گا
میں لال لال آنسوؤں

دل میں کتنی بے باک و تابناک لہریں ہیں، جو ساحل تک آجانے کے لئے بیکل اور بے قرار ہیں۔

عام طور پر اُردو شعر و شاعری حسن اور اس کے لوازم، عشق اور اس کے دواعی کی سطحی اور سستی مادیت کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی۔ امیر خسرو سے آج تک اس قید و بند سے نکلنے کی کوئی ایسی منظم کوشش نہ ہو سکی جو بہر نوع کامیاب کہی جائے۔ ایسی شاعری کے لئے فرصت بے پایاں درکار ہوا کرتی ہے اور کلیم صاحب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس قدر مصروف کار تھا کہ انہیں فرصت بے پایاں کہاں سے ملتی۔ مگر انہوں نے ان سارے مفروضات بلکہ حقائق کو غلط بنا کر دکھا دیا۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی ارمانی گو ہیں، لیکن لَنْ ترانی سننے کے مستحق نہیں۔ ان کے دل میں بھی کسی جلوہ میں سما جانے کی خواہشیں اُمڈتی رہتی ہیں اور وہ ان جلووں کو سمیٹنے کی تاب بھی رکھتے ہیں۔ وہ برابر شعر گوئی کے لئے وقت نکالتے رہے اور زبان حال سے یہ کہتے رہے، لی مع الشّعر وقت لا یسعنی احدا (میرے لئے ایک ایسا وقت ہے، جب میں شعر کہتا ہوں، اس دم میرے نزدیک کسی کے رہنے کی گنجائش نہیں۔

ان کے دل کی یہ آواز ان کے ماحول کی صدائے بازگشت بھی اور ان کی وراثت کا تقاضہ، کلیم صاحب جس خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، اس کا پیشہ تو شاعری نہ تھا لیکن اس کا محبوب مشغلہ ضرور شاعری تھا، ان کے نانا حضرت حکیم عبد الحمید پریشاں۔ والد محترم حضرت ڈاکٹر عظیم الدین عظیم اور عم مکرم حکیم فہیم الدین فہیم سے اب تو ہر اردو دوست اچھی طرح واقف ہے، یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ کلیم صاحب کی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی۔ جن دنوں یہ اسکول کے طالب العلم تھے، ایک غزل،

کا ہار اُسے پہناؤں گا

مگر یہ سب بکواس ہو کر ختم ہو گیا، منت وزاری کام نہ آئی اور ابر تیز رَو وہ صاعقہ بردوش پیام برغائب ہو گیا، روٹھ کر کہیں چلا گیا۔ اس نے لاکھ دُہائیاں دیں، بے سود ہوئیں، التجائیں کیں، نقش بر آب ثابت ہوئیں:

نہ جانے ابر تیز رَو
مرا کہاں چلا گیا
فضاؤں میں بھٹک گیا
بھٹک گیا، سٹک گیا

مگر شاعر کو پھر بھی منتظری ہے، اسے پھر بھی یقین ہے کہ وہ صاعقہ حق جلوہ افگن ہو گا، جواب لائے گا، یہ اس کی رجائی فطرت کا تقاضا ہے کہ حرمان نصیبی میں بھی امید کا دیا جلائے رکھتا ہے، اس لئے کہ اس کے عہد میں لوگ مایوسی کے مہیب غار میں گر چکے ہیں۔ انھیں سہارا چاہیئے، وہ سہارا خالی خولی تصوّف اور روحانی نہیں، بلکہ وہ مادی سہارا کا محتاج ہے، ——— اور یہ سہارا ہے کامیابی کا یقین، وہ انتظار کی تیکھی گھڑیاں کاٹ رہا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ابر تیز رَو پیام لے کر ضرور لوٹے گا، وہ لوٹ رہا ہو گا۔

یہ دل سے اپنے کہتا ہوں
وہ آئے گا، وہ آئے گا
پیام لے کے آئے گا
سرودِ کیف لائے گا

اس نظم کے چوتھے حصّہ میں، اس آخری حصہ میں شاعر نے انسانی

ردعمل کا اظہار کیا ہے، پہلے حصے شکوۂ خداوندی تھے اور یہ حصہ جواب شکوہ اثر انسان پیش کرتا ہے، اس حصہ کے بھی دو حصے ہیں، پہلے میں تو وہی تیز، تیز آب کی طرح تند ردعمل ہے، اقبال کی طرح شاعر یہ پوچھتا ہے :

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے یہ جہاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! یہ جہاں تیرا ہی یا میرا

شاعر گستاخ و شوخ ہے۔ پستی کا مکیں ہوتے ہوئے بے باک بھی ہے، :-

یہ کیا کہا ، یہ کیا سُنا
میں اب کبھی نہ آؤں گا
یہ طعن کیوں، یہ طنز کیا
بھلا مرا قصور کیا
تری یہ عقل تیز ہوش
ترا یہ عشق سرفروش
تمیز خیر و شر تری
یہ دل ترا ، یہ جاں تری

بھلا اس میں انسان کا کیا قصور، ہر خوب و زشت کا مالک تو ہے، زمین تیری ہے، آسمان تیرے ہیں۔ کہنے کو ہم آزاد ہیں، خود مختار ہیں۔ مگر :-

ناحق ہم مجبوروں پر، تہمت ہے مختاری کی
چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ہمارے ہاتھ پاؤں، سارے جوارح، سارے اعضا ہمارے ہیں، مگر ہمارے

نہیں ہیں، تُو تو ہر شئے کا خالق ہے، ہر شئے کا مالک ہے، جنگ کا مالک ہے، امن کا مالک ہے، خیر کا مالک ہے، شر کا مالک ہے۔ ہم تو ایک کھلونا ہیں، مجبور بے بس، ترے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے، ہمیں تو قسمت کی لکیریں زنجیریں بن کر ہر آن کس رہی ہیں، پھر یہ فطرت کی تعزیریں کیسی اور یہ عبرت کی زنجیریں کیسی، ہم کو اپنے فعل پر قدرت کہاں، اپنے دل پر قابو کہاں :

یہ طنز پھر، یہ طعن کیوں
مرا نظام کل کہاں
مری زمام دل کہاں
غلط، دروغ، افترا

شاعر اتنا کہتے ہی اپنی خیالی دنیا سے واپس آجاتا ہے، وہ سنبھل جاتا ہے اور ہوش و حواس ٹھکانے کر کے خالق کُل کے آگے سر نیاز خم کر دیتا ہے۔ یزداں کے شکووں کو صحیح سمجھ کر اپنی بدزبانی پر نادم ہوتا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ دکھا دیتا ہے :

بک گیا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

وہ اپنے منصب سے تجاوز کر گیا۔ اس احساس سے وہ بوکھلا گیا اور شرم سے پانی پانی ہو گیا :

ارے یہ مجھ کو کیا ہوا
یہ کیا زباں پر آگیا
جنوں جنوں دکھا گیا

وہ اپنی کوتاہیوں کا معترف ہے، اس کی عقل ہی میں فتور ہے۔ اس کے عشق میں قصور ہے۔ یہ اس کی نااہلی ہے کہ :

وہ جانِ جانِ زندگی
خفا ہے، یوں ہے خشمگیں

اب اس کی دیوانگی بڑھ جاتی ہے، انسان کو احساسِ جرم کے بعد اگر تلافی کا موقع نہیں ملتا ہے، تو نفسیاتی طور پر وہ اور بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ذلت و رسوائی سے کسی کام کا نہیں رہتا :

میں کس کو منہ دکھاؤں اب
میں کیسے منہ دکھاؤں اب
مناؤں اس کو کس طرح
میں سونے سونے دل میں پھر
بساؤں اس کو کس طرح

اب وہ تلافیٔ مافات کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ اپنی تقصیرات سے بھولے ہوئے رشتوں کی تعمیر کا کام لینا چاہتا ہے۔ وہ دوبارہ پیغام بھیجنا چاہتا ہے، اپنے ایلچی کو مناتا ہے، اس کی منتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اسے ایک موقع اور ملے تو وہ دُنیا کو جنّت بنا دے، اپنے وطن کو رشکِ فردوس بنا دے۔ اگر وہ حسنِ مطلق پردہ سے باہر آئے، تو اب اس کو رنج و غم کی کوئی وجہ نہ ہوگی، وہ وعدے کرتا ہے کہ دنیا سے درد و غم مٹا دے گا، مفلسی، رہزنی، بے انصافی، ظلم، جبر، تشدّد دُور کر کے دم لے گا، اپنے وعدوں کی توثیق کے لئے وہ قسم پر قسم کھا رہا ہے اور ہر قسم پر اپنے خلوص و جذبۂ ایمان کی مُہر لگا رہا ہے :-

قسم ہے فکر و جوش کی
قسم ہے درد و ہوش کی
یہ درد و غم مٹاؤں گا
یہ جبر و خوں مٹاؤں گا
یہ بیکسی و رہزنی
یہ جان و دل کی جانکنی
میں یک قلم مٹاؤں گا

اب وہ دل میں ٹھان چکا ہے کہ اپنے ایمان اور عمل صالح سے خدا کو مجبور کر دے گا کہ اپنا وعدہ پورا کرے۔ دونوں اپنے اپنے وعدے بھول گئے ہیں، پھر نیا فلک وجود میں آئے گا، نئی زمین ہوگی اور اس زمین کو گلزمیں بنایا جائے گا۔ اب ساری بزم نئے طور پر سجائی جائے گی اور ایک بار پھر انسان خلیفتہ اللہ فی الارض بن کر ساری کائنات پر تسلط رکھے گا، سارے جہان پر تصرف کرے گا، وہ مجبور ہو کر بھی مختاری دکھلائے گا، محدود ہوتے ہوئے بھی ساری حد بندیوں کو توڑ دے گا۔ فانی ہوتے ہوئے بھی باقی اور غیر فانی ہستیوں کے ساتھ رہ سکے گا۔

وہ دل میں میرے آئے تو
میں دل اسے بناؤں گا

کلیم صاحب نے اپنی نظموں میں ایک نئی تکنیک برتی ہے۔ الفاظ اور فقرے کے تکرار سے کلام میں زور پیدا کرنا، ان کے فن کا کمال ہے۔ اس نظم میں بعض ٹکڑے ایسے ہیں، جن میں بظاہر بے ضرورت الفاظ کا اعادہ ہوا ہے۔ مگر غور کرنے سے پتہ

چلتا ہے کہ جن احساسات کو یہ مخاطب کے ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں، ان کو ٹھہر ٹھہر کے، ہر جزوی تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں، تاکہ وہی احساس، وہی جذبہ بعینہٖ دوسروں تک منتقل ہو جائے۔ مثلاً :

بہارِ بوستاں بھی دوں
نگارِ آسماں بھی دوں
زمیں بھی اس کو نذر دوں
فلک بھی اس کو نذر دوں
یہ دل بھی اس کو نذر دوں
یہ جاں بھی اس کو نذر دوں

مترادف الفاظ کے باریک معنوی فرق پر ان کی نگاہ اچھی ہے ــــ اس نظم میں انہوں نے چمک، کڑک، گرج، تینوں کو ان کے سارے معنوی فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ ملامت، مذمت، ندامت میں جو لطیف فرق ہے اس کو بھی استعمال سے ظاہر کر دیا ہے۔

(۲۵) اداس، مضمحل اور افسردہ شاعر اپنی ویرانی اپنی بربادی دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہے، اس کی استفہامیہ طبیعت سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، وہ بیزار ہے اپنے حال سے، حیران ہے دنیا کی چال سے، اس طرح کی حیرانی اور فریب کاری کا سلسلہ برابر جاری رہے گا:

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

مگر نہیں، شاعر حیرت زدہ ہے کہ جب اس کا دل ویران ہے، تو پھر دل کی آبادی کے یہ سامان فطرت نے کیوں بکھیر رکھے ہیں۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ بیکسی

چاروں طرف منڈلا رہی ہے، ایک ویرانی ہے کہ بسی جا رہی ہے:

میں ہوں دل ویراں ہے
ویران نگاہوں میں
ویرانۂ دنیا ہے
اک خاک سی اڑتی ہے

اس کے لئے فطرت کی یہ رنگا رنگی بے معنی ہے۔ تارے جگمگا رہے ہیں، اُفق پر شفق پھولی ہوئی ہے، آسمان پر قوس قزح اپنی رنگین بہار کا تماشا کر رہی ہے، غنچے چٹک رہے ہیں، پھول کھل رہے ہیں۔ لیکن کس کے لئے، اس کے لئے۔ شاعر کے لئے، ایسے مہجور انسان کے لئے، نہیں، ہرگز نہیں، اس کا دل اُداس ہے، آنکھیں ویران ہیں۔ اس کے دل کو آباد کرنے والا، اس کی آنکھوں کو بسانے والا چلا گیا، دور دیس، جہاں جانا بھی چاہیں تو....، جا نہ سکیں

محبت کا جنوں شاعر کو اس طرح بے قرار کر رہا ہے کہ وہ دنیا کی ساری مسرتوں کا حقدار خود کو سمجھ کر دنیا کی ناانصافی پر ضرب لگا رہا ہے۔ دنیا کا چکر چل رہا ہے۔ نت نئے محبوب ارائش خم کاکل میں لگے ہوئے ہیں۔ اندیشہ ہائے دور و دراز سے بے پروا انسان، فطرت کی گلکاریوں سے مسحور ہو رہا ہے محبت کا چلن بدستور باقی ہے۔ محبوب اسی طرح بن سنور رہے ہیں۔ وہ اسی طرح اس فکر میں ہیں کہ کوئی ان کو دیکھے، مگر شاعر ان کی اس حماقت پر تعجب کرتا ہے:

یہ نور جبیں اپنا
اب کس کو دکھاتی ہے

عشق اب بھی شوریدہ سری کرتا ہے، حسن ابھی تک مچل رہا ہے۔ درد

اور ٹیس ابھی تک دلوں میں اٹھ رہے ہیں، آنکھیں ہنوز اشکبار ہیں، مگر کس لئے، شاعر تو ان سے بیزار ہو چکا ہے۔

مجبور نظر کیوں ہے
کیوں اشک ٹپکتا ہے
اب دل کی تپش اپنا
دل کس کو دکھاتی ہے

شاعر کے خیال میں محبت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا دل صرف اس کے پاس ہے، اس لئے محبت کے لائق صرف اسی کا دل ہے، ساری کثافتوں سے دور، لوث الفت سے معمور، مگر حیات میں تسلسل ہے، موت میں تسلسل ہے اور محبت غیر فانی ہے، قدرت کے مناظر لازوال ہیں، یوں ہی ہوتا رہا ہے، یوں ہی ہوتا رہے گا۔ ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے۔ یہی کارخانہ ثبات ہے۔ اس لئے زندہ رہنے کی خاطر زندگی کی جامد حقیقتوں سے دوچار ہونا ہوگا، زندگی کی بہاریں ہر چہار طرف بکھری ہوئی ہیں۔ قدرت کے کرشمے آج بھی اشارے کر کے بلا رہے ہیں۔ مگر محبت کرنا، تو جان سے جانا ہے۔ کون جیتے جی اس عذاب میں پڑے گا کس کی ہمت ہوگی کہ آگ دیکھ کر بھی آگ میں کود جائے۔ یہ تو شاعر کا ہی ظرف تھا، اس لئے بار دگر متعجب ہوتا ہے کہ اس کے دل میں کسک ہے لازوال، ایک محبت ہے بے پروائے مآل، جس نے اس کے پھول کو بھی کانٹا بنا دیا، اور ان کانٹوں سے خون ٹپکا دیا، اب تو ہر جگہ تباہی کے آثار ہیں:

رنگین دھنک دیکھو
آنکھوں کی چمک دیکھو

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اور دل کی کسک دیکھو
کانٹا بھی کھٹکتا ہے
کیا خون ٹپکتا ہے
دیکھا ہے نہ دیکھے گا
دل کون لگائے گا
کیوں جان سے جائے گا

ان سب بہار سامانیوں کے باوجود، ان ساری رعنائیوں کے ہوتے ہوئے رنگینیوں کی ریل پیل میں جب کہ محبتوں کے خزانے لٹ رہے ہوں۔ رعنائی و محبوبی کے انداز سارے جہان میں بکھرے ہوئے ہوں، شاعر تنہا ہے۔ بے بس ہے۔ اس کا دل سنسان ہے۔ اس کی نگاہیں ویران ہیں اور رہ رہ کر غول بیابانی کے شور سامعہ پر بار ہو رہے ہیں، اس سے فضا کی خموشی کچھ مضطرب ہو جاتی ہے۔ حسرت و فانی کی طرح کلیم صاحب کی آواز میں بھی درد ہے۔ مگر وہ درد سے بیکار نہیں ہو جاتے، بلکہ یہ درد انھیں عزم عمل عطا کرتا ہے۔ تاکہ ان کا محبوب جو ہر آن ان کے سامنے رہتا ہے۔ کبھی ان پر غفلت وجود و خمود کا طعنہ نہ دے حیات کو قابل زیست بنانے رہنے کی تلقین کرے اور اس طرح اس کے احساس کو مہمیز کرے۔ اسی لئے وہ درد اور کراہ کو قابو میں رکھتے ہیں۔ خود اس کے قابو میں نہیں چلے جاتے۔ ۳۵ مصرعوں میں انھوں نے مکمل رازداری کے لہجے میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی ہے، اپنی اس خود کلامی میں انھوں نے ہمیں سوچنے سمجھنے کے بہت سارے رخ عطا کئے ہیں:

سنسان نگاہیں ہیں

پہلی غزل لکھ کر اپنے ایک عزیز کو دی، وہ غزل مشاعرہ میں پڑھی گئی اور بہت مقبول ہوئی، ان کی ہمت بڑھی اور اب غزلیں کہہ کہہ کر دوسروں کو دینے لگے۔ ولایت جانے سے پہلے تک انہوں نے کافی تعداد میں غزلیں کہہ ڈالیں۔ مگر اپنے پاس کچھ نہ رکھا، سب لوگوں میں تقسیم کر دی۔ اس طرح خود تو وہ کبھی مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھ نہ سکے مگر اپنی غزلوں کو سُنا ضرور۔ آج کل بھی یہ رواج ہے کہ لوگ اشعار کسی نہ کسی وجہ سے لکھ کر دوسروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور مشاعروں میں سُن کر کبھی کبھی اندر سے کُڑھتے بھی ہیں کہ بیکار ایسے اشعار دوسروں کو دیئے۔ میں نے ان سے بہت پوچھا کہ کسی ایک کا بھی نام بتا دیجئے جن کو آپ نے اپنی غزل لکھ کر دی تھی مگر ان کی فطری خاموشی نے ان کی مدد کی۔ صرف دو مشاعروں کے بارے میں بتا سکے، ایک تو وہ جس میں بدر آروی اور علامہ شاد عظیم آبادی موجود تھے، اس میں کلیم صاحب شریک ہوئے تھے اور اپنی غزل بھی پڑھوائی تھی۔ دوسرا وہ مشاعرہ جو خود ان کے گھر پر ہوا تھا، جس کی طرح تھی:

"ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"

اس طرح میں بھی انہوں نے ایک غزل لکھی تھی، جو وہاں پڑھی گئی اور اس کی تعریف بھی کی گئی۔ یہ ساری غزلیں روایتی انداز کی ہوا کرتی تھیں، جس کا انہیں اعتراف ہے۔

افسوس ہے کہ ابتدائی کلام کے نہ ہونے سے ہم کلیم صاحب کے ذہنی ارتقا، اور مزاج شاعری پر کما حقہ بحث نہیں کر سکتے، یہ امر قابل اطمینان ہے کہ غزلوں سے ان کی اندرونی وابستگی ان کے دونوں شعری مجموعوں سے ظاہر ہو جاتی ہے، میں سر دست اپنے تبصرہ کو ان کے پہلے مجموعہ تک محدود رکھتا ہوں۔

اس مجموعہ میں سب سے پہلی چیز جو ہمیں چونکا دیتی ہے، وہ ہے شاعر کی شعوری طور پر نفرت غزل سے، اس شعوری کوشش سے قدرے آورد کی غمازی ہو جاتی ہے

سنسان دل و جاں ہیں
سنسان بیاباں ہیں
یہ غول بیابانی
کیا شور مچاتے ہیں

(۲۶) اس نظم میں ۸ مصرعے ہیں اور اس کا مرکزی خیال آخر کے دو مصرعوں سے معلوم ہوتا ہے۔

دل ایک صنم سے کیسے بھرے
کعبہ میں بساؤ لاکھوں صنم!

انسان بالطبع ہر عظیم اور مہیب شئے کو اپنا معبود تسلیم کر لیا کرتا ہے اور اس طرح اپنی امیدوں کا ایک سہارا بنا لیتا ہے، قدیم یونانی نظریہ کے اعتبار سے ہر مظہر قدرت کو ایک خدا بنا دیا گیا تھا، یونانی ہزاروں خدا کے قائل تھے (Polo Theism) دریاؤں کے خدا کا نام نائڈ (Naid) تھا۔ درختوں کے خدا کا نام (Dryad) تھا، فطرت کے خدا کا نام (Nymph) تھا۔ یہی نظریہ مغرب میں رائج رہا۔ ہندو فلسفہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا، جو ابھی تک چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اس لئے کہ انسان اپنی بے بسی میں طرح طرح کی پناہ کا متلاشی ہوتا ہے، اس کی ناآسودہ طبیعت، اس کی نافرمان فطرت نئے نئے رنگ بغاوت نکالتی ہے۔ اس کے لئے اس کو نت نئے خداؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔ سارے مذاہب اور قوانین فطرت کا سرسری مطالعہ بھی یہ بتا دیتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے خدا کا تصور انسان کے لئے ضروری جو نیچری کہلاتے ہیں وہ بھی فطرت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ حد یہ کہ اشتراکی

حضرات جو خدا کے وجود کے منکر بھی ہیں وہ بھی اشتراکیت کے بانی اعظم یا اس کے رہبران ملت کے ساتھ ایسی محبت، ایسے خلوص اور ایسی نیازمندی کا اظہار کرتے ہیں، جن سے انھیں خدا ہی کے عوض ایک ہستی، سہارا دینے والی مل جاتی ہے۔

ابتدائے خلقت میں جب خدا تھا مگر خدائی نہ تھی۔ خدا کو اپنے جانے جانے کی کوئی فکر نہ تھی، ایک سکون تھا، جو ساری کائنات پر چھایا ہوا تھا:

یہ دل کا مندر سونا تھا
تاریکی گہری چھائی تھی
سناٹا لہریں لیتا تھا
آتا تھا نہ کوئی جاتا تھا

پھر انسان پیدا ہوا اور آخر انسان کا دل اس بے کیف زندگی سے گھبرا گیا اور اس نے اپنی اپنی پسند کے معبود بنا لئے:

اک شوق جبیں سائی نے ترے معبود بنائے چن چن کر
اے وعدہ فراموش ازلی، وعدوں کی وفا کا نام نہ لے

انسان اشرف المخلوقات ہے اور پیشانی اس کا اشرف عضو، اشرف المخلوقات کا یہ اشرف عضو، اشرف ترین ہستی کے سامنے جھکنا چاہیئے۔ مگر اس کی متنوع فطرت نے ہر آن، ہر تقاضا، ہر تصور اور ہر ضرورت کے لئے ایک معبود بنا لیا، تاکہ ہر انسان کی ہر مراد بر آئے اور وہ اپنی نیازمندی کا اظہار اپنی جراءت کے لحاظ سے برابر کرتا رہے، قدرت کو انسان کا یہ ہرجائی پن۔ خالق کو اپنے مخلوق کی بے غیرتی اچھی نہ معلوم ہوئی، وہ گھبرا کر، رنج ہو کر، شرما کر اس معمورہ سے دور چلا گیا، وہ حسن کا پتلا، وہ خلوص کا سرچشمہ، وہ خالق کل، اپنے نائبوں

کی جماعت میں اتنے سارے رخنے دیکھ کر انسان کی نادانی پر متحیّر ہے۔ وہ انسان جس کو اس نے اپنے علم سے، علم عطا کیا، اپنی بے نیازی سے بے نیازی دی — اور اپنی قدرت سے قدرت، وہی انسان واہمہ کا اس طرح شکار ہو گیا کہ ایک خدا کی ساری بندھنوں کو توڑ کر، انسانیت کا چولا اُتار کر حیوانوں کی جماعت میں ضم ہو گیا۔ جب انسانیت پر حیوانیت مسلّط ہو گئی، تو دنیا میں فساد، خونریزی اور انتشار کا پھیلنا ناگزیر ہو گیا۔

امیر کا دامن چھوٹ گیا
گھبرا کے یہ آخر دل نے کہا
اب آؤ بنائیں ایسا صنم
جو حُسن میں اپنے یکتا ہو
جو بجلی کو بھی شرمائے
جو دل کو میرے گرمائے
جس کو دیکھوں، جس کو پوجوں

اصل یہ ہے کہ انسان اس طرح مادہ پرست اور مادہ کا شکار ہو گیا ہے کہ وہ ان دیکھے خدا پر ایمان رکھ نہیں سکتا، اسے ایک محسوس خدا چاہیئے۔ چنانچہ ایک کے عوض لاکھوں محسوس خدا بنا ڈالے۔ پھر بھی انسان کی نیاز مندی باقی رہی اور مختلف معبودوں کی تخلیق ہوتی رہی۔ طرح طرح کے مندر بنتے گئے اور سجتے گئے ہیرے کے، زمرد کے، لعل و گہر کے، ایسے مندر جن کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں

یہ کیسے جڑے ہیں لعل و گہر
ہیرے کی چمک، نیلم کی دمک

سے دیکھو آنکھیں خیرہ ہیں

اس کے بعد فطرت کو خدا بنایا گیا، جو چاند ستاروں میں نظر آنے لگے سورج میں دیکھے جانے لگے، پہاڑ، زمین آسمان، وادی، صحرا، دریا کی موجیں درخت کی ڈالیاں، باغ اور باغ کے گلہائے رنگین ایک ایک خدا بن کر سامنے آنے لگے اور ان خداؤں نے اپنی رضا کا اظہار بھی ان عابدوں کی باتیں مان کر کیا، مگر انسان کی بے بس فطرت نے پھر پلٹا کھایا، اس نے ان خداؤں پر بس نہ کی۔ نت نئے خدا بنانے میں مشغول رہا۔ نئے نئے صنم خانے ایجاد کئے، شاہی کے مندر، غریبی کے مندر، فقر و غنا کے مندر، ان مندروں کے اصنام اسی طرح کے ہیں، جیسا وہ چاہتے ہیں: ؎

وہ شاہی کا دیکھو مندر
کیسا رنگیں، کیسا زریں
یہ فقر و غنا کے مندر ہیں
یہ بیم و رجا کے ہیں مندر

اب تو انسان ہر روز ایک نیا بت تراشتا ہے اور اس کی پوجا کرتا ہے۔ کوئی ضرور نہیں کہ وہ ان اصنام کو دیکھ بھی لے اور دیکھے بھی تو کس طرح مگر، صنم گری کا بھوت سر پر سوار ہے: ؎

ان میرے خیالوں سے بنتے
ہیں روز نئے رنگین صنم
کچھ رنگ و خوں میں پلتے ہیں
کچھ قوم و وطن میں سجتے ہیں

کہیں رنگ و نسل کی پوجا ہوتی ہے، کوئی قوم وطن کو معبود سمجھتا ہے، کوئی اپنے مذہب کو اپنا معبود بنا رہا ہے۔ کبھی جمہور کو خدا بنایا جا رہا ہے۔ الغرض نو بہ نو اصنام اُبھر رہے ہیں۔

شاعر کا رشتۂ خیال یک بیک ٹوٹ جاتا ہے، اس کے خیالات پر بجلی گر پڑتی ہے اور اس کے اصنام سب پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ وہ ان مندروں میں کبھی نہیں جائے گا۔ وہ ان بتوں میں سے کسی کی پوجا نہ کرے گا، وہ ان اصنام کے ٹکڑوں کو جمع کرے گا اور ایک نیا صنم بنائے گا۔ یہ صنم اس کی پسند کا ہوگا، مگر یہ صنم سارے اصنام کے ریزوں سے بنا ہوا ہوگا۔ اس لئے اس صنم پر کسی خاص انسان یا جماعت کا قبضہ نہ ہوگا، کلیم صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ جو رام ہے، وہی رحیم ہے، مندر میں بھی وہی ہے، جو طور پر شعلہ فگن تھا۔ دیکھنے والی نظر چاہیئے۔ اقبال نے بھی نیا شوالہ بنانا چاہا تھا، کلیم بھی نیا مندر بنانا چاہتے ہیں:

لو آؤ چنو ان ریزوں کو
اور ان سے بناؤ شکلیں نئی
اور ان سے بناؤ، ان سے سجو
پھر اپنے خیالوں کے مندر
آذری بھی حیراں ہو اس صنم تراشی پر
سو بتوں کو جوڑیں گے، اِک خدا بنائیں گے

آخری دو مصرعے بار بار پڑھیئے، تو معلوم ہوگا کہ باوجود ساری بے تعلقی کے شاعر کی زبان پر آ ہی گیا:

دل ایک صنم سے کیسے بھرے
کعبہ میں بساؤ لاکھوں صنم

اس نظم میں خالق و مخلوق کے رشتوں کو مضبوط بنانے کی ایک نئی کوشش ہے اور انسان کی تیرہ بختیوں کے اسباب و علل کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ یہ بھی جواب شکوہ کی شان لئے ہوئے ہے۔ اس میں ایک ایسا شیریں و شکر آمیز طنز ہے کہ بالائی سطح پر سکون نظر آتی ہے۔ لیکن پڑھیئے تو اندر سے طبیعت تلملا کے رہ جاتی ہے۔ ہر انسان کو اپنی صورت اپنی تقدیر اپنا کردار سامنے دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس کی بدراہیوں کا آئینہ ہے؛ یہ نظم مقصدی ہے، مگر شاعرانہ نزاکتوں سے بھرپور، ذوقِ سلیم پر اظہارِ مقصد کسی طرح بھی گراں بار نہیں ہو پاتا۔

(۲۷) ۴۳ مصرعوں کی یہ نظم آزادی اور آزادی کے صحیح اقدار متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ آزادی اور غلامی ایک اضافی امر ہے۔ کون آزاد ہے اور کہاں تک آزاد ہے، یہ سب اپنے اپنے خیال کی پرواز ہے، ورنہ ہر آزادی حقیقت میں ایک پابندی ہے اور ہر پابندی سے خوش سلیقہ انسان آزادی کا کام لے سکتا ہے۔ ایسے دور میں جبکہ ہر چہار طرف آزادی کا نغمہ الاپا جا رہا ہے، ہندوستان کا کونہ کونہ آزادی کی تڑپ سے بے قرار ہے، اس دنیا کا ذرہ ذرہ آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتا رہتا ہے، شاعر ایسے خام کاروں کو تنبیہہ کرتا ہے، وہ خود بھی آزادی پسند ہے اور آزاد رہنا چاہتا ہے، مگر اسے ایسی آزادی پسند ہے، جو واقعی آزادی کہی جا سکے، وہ آزادی ہر فرد کی ہو، اور افراد کی بدولت جماعت کی ہو اور جماعتوں سے گذر کر قوم کی، شہر کی،

ملک کی اور سارے عالم کی ہو، ایسی آزادی جو غلامی سے بدتر ہو، اس کو کوئی ذی شعور انسان پسند نہیں کر سکتا، آج کل یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ نئے نئے آزاد ہونے والے افراد، خود کو ہر طرح کی پابندی سے آزاد کر دیتے ہیں، وہ محکومی سے اس طرح متنفر ہو گئے ہیں کہ اب کسی طرح کی محکومی کو وہ دیکھنا گوارا نہیں کرتے، خواہ وہ پابندیاں آزادی برقرار رکھنے کے لئے کیوں نہ ہوں خواہ وہ محکومیاں حاکمیت کے استقرار کی خاطر کیوں نہ ہوں خواہ وہ حد بندیاں انھیں انسان بنے رہنے میں مدد ہی کیوں نہ کرتی ہوں۔

یہ ان کی خام خیالی ہے، دنیا میں، ساری کائنات میں، سارے مظاہر فطرت میں آزادیوں کی تہ کو بے نقاب کیجئے، تو پابندیاں ملیں گی:

چمن میں سنتے یہ آئے ہیں سرو ہے آزاد
مگر بنایا ہے فطرت نے پا بہ گل اس کو
مری ہنسی بھی ہے پابند، میرے آنسو بھی
مری نگاہ ہے محصور میری آنکھوں میں

اس طرح شاعر اپنی مجبوری کو، اپنی محکومی کو قابل برداشت بنانا چاہتا ہے۔ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے اصول کو وہ اچھی طرح مانتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آزادی کہاں، کیسی آزادی کس کی آزادی۔ دنیا میں ہر جگہ قید و بند ہے۔ حیات کی بیڑی ہے، تو غم کی زنجیر غریب عقل تک ان دنوں مجبور تماشا ہے۔ اور دل بھی پابند ہے، ہمارا خندہ پابند سرور ہے، ہماری آنکھیں اپنے حلقوں میں قید ہیں،

مگر یہ وہم ہے آزاد ہے میری دنیا
مرا خیال ہے آزاد، فکر ہے آزاد

یہ کیا طلسم ہے، کیسا فریب ہستی ہے
کہ بے بسی ہے سراپا نگار آزادی

ہم اپنی بے بسی کو سراپا نقش آزادی سمجھ بیٹھے ہیں اور ہم اسی طلسم میں مبتلا ہیں اور مبتلا رہنا بھی چاہتے ہیں، اب نظم ارتقا کی طرف چلتی ہے اور اتنے استعارے اور ایسی ایسی تشبیہوں اور اتنی حقیقتوں کو سامنے لے آتی ہے کہ ماحول میں ہر طرف قید و بند ہی دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف جال پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، ہر سمت زنجیروں کی جھنکار سننے میں آنے لگتی ہے:۔

فلک پہ چاند ستاروں کا شب کو سیمیں جال
زمیں پہ پھولوں کے دیکھو بچھے ہیں رنگیں جال
پھر اس پہ حسن نے پھیلائے ہیں یہ زریں جال

شاعر کی ایک مشاہدہ سے سیری نہیں ہوتی، وہ پے بہ پے تجربات کے جال پھیلاتا جا رہا ہے، آسمان پہ چاند ستارے جال بن رہے ہیں۔ زمین پر پھول بھی جال بنا رہے ہیں، ہمارے دل کی امنگیں، ہماری آرزوئیں، ہماری امیدیں، ہماری حسرتیں سب کی سب زنجیریں ہیں۔ اور ہم ہر لمحہ، ہر آن ان زنجیروں کی کڑیاں درست کرنے میں مصروف ہیں۔ زندہ ہیں تو یہ ساری زنجیریں پہننی ہوں گی۔ وجود میں لائے گئے ہیں تو سارے سلاسل کو گلے لگانا ہوگا اور سمجھنا ہوگا کہ آزادی کہاں وہ تو فریب نارسیت ہے، پابندی کہاں وہ تو اقتضائے فطرت ہے، انسان اپنے اوہام باطلہ سے طرح طرح کے حلقے بنا رہا ہے۔ اس لئے انسان ان انسانی زنجیروں سے نجات کہاں پا سکتا ہے۔ تمیز بندہ و آقا فساد کا سلسلہ دراز کرتا ہے، رنگ اور نسل، قوم و ملت، وطن، مذہب، معتقدات

مزخرفات، سرمایہ کا طوق، مزدوری کی زنجیر، وہ ان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور یہ ننھی سی جان طوق و سلاسل کے لئے ہی تو پیدا کی گئی ہے۔ اس کی زبان سے جو بات بھی نکلتی ہے، وہ لفظوں کی زنجیر ہی میں جکڑ کر سامنے آتی ہے:

خیال محنت و سرمایہ جنگ کی زنجیر
یہ رنگ و خون بھی ہے زنجیر، قوم و ملت بھی
وطن بھی، مذہب و اوہام بھی ہیں زنجیریں
مرا شعور بناتا ہے اپنی زنجیریں
یہ میرے شعر جو اشکوں میں میرے ہلتے ہیں
یہ کیا ہیں؟ لفظوں کی اُلجھی ہوئی سی زنجیریں

اس نظم کا یہ حصہ شعور سے متعلق تھا، اب تحت شعور کی باتیں سنیئے:

چمکتے محلوں میں اللہ! کیا کرشمہ ہے
نہ جانے کتنے بنے ہیں طلسمی تہہ خانے
اور ان طلسموں میں کتنے بسے ہیں جادوگر
جو روز نت نئے جادو جگایا کرتے ہیں

سرمایہ و محنت کی آویزش سے شاعر کا دل بھی متاثر ہے، وہ عالیشان محلوں کی طلسمی آزادیوں کا پردہ چاک کرتا ہے، وہ ان جادوگروں کا پول کھولتا ہے، جو اپنے جادو سے کچھ ایسی آزادی زدہ کٹھ پتلیوں کو سامنے لاتا ہے، جو رقص و نغمہ سے دل لبھانے کے ہر انداز سے کام لے کر انسان کی ہمارے روحوں کی رہی سہی آزادی سلب کر لیا کرتی ہیں۔

ایک سچے شاعر کی طرح عالم کی ہر شئے پہ اس کی نظر ہے، اور وہ ہر شئے

کو اپنے قالب فکر میں ڈھالنا چاہتا ہے، مگر انداز تو دیکھئے کیسا معصوم کیسا پیارا،

ہمارے دل میں دھڑکتی ہیں کتنی زنجیریں
ہمارے خوں میں اُبلتی ہیں کتنی زنجیریں
ہماری سانس میں پلتی ہیں کتنی زنجیریں

آخر میں وہی دو مصرعے لائے گئے ہیں۔ جن سے اس نظم کی ابتدا ہوئی ہے اور اس طرح اس نظم کو بھی ایک پابندی عطا کر دی گئی۔ ان مصرعوں میں سارے خیالات کو نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ انسان پر اتنے قدغن محض اسی لئے تو ہیں کہ وہ زندہ ہے اور زندگی کا گناہ کر بیٹھا ہے۔ بس ایک گناہ کی اتنی سخت سزائیں کہ ہر آن اس کو ضمیر فروشی کرنا پڑے۔

گناہِ زیست پر اللہ! اتنی تعزیریں
یہ جان جان نزاکت، ہزاروں زنجیریں

(۲۸) ۹۴ مصرعوں کی اس نظم کا آخری ٹکڑا پہلے پڑھیئے :۔

کوئی سمجھائے میرے شعروں کو
یہ مری بات کچھ نہیں سنتے
نت نئی شوخیاں دکھاتے ہیں

یہ پوری نظم شاعری کے اقتضائے فطرت شعر کے تقاضائے خلقت، اور شاعر کے رجحان طبیعت کے تصادم کو ایک دلکش پیرایہ میں پیش کرتی ہے اپنی سیمابی طبیعت کو غزل کی طرف شاعر مائل کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کے الفاظ اس کے خیالات اور ان سے پیدا شدہ نغمات بغاوت کر جاتے ہیں اور وہ